ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ

ندائے اعتدال علی گڑھ

جولائی ۲۰۲۴ء

30/=

علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، علی گڑھ

قرآن کا پیغام

معیارِ فضیلت

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

یَاۤ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَا كُمْ مِّنْ ذَ كَرٍ وَّ أُنْثٰى وَ جَعَلْنَا كُمْ شُعُوْباً وَّ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا ۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقٰكُمْ ۔ إِنَّ اللهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۔ (الحجرات: ۱۳)

اے لوگو! اللہ نے تم کو ایک باپ آدم اور ایک ماں حوا سے پیدا کیا۔ تمھاری اصل ایک ہی ہے، پھر تم میں سے کچھ لوگ دوسروں پر نسب کو لے کر فخر کیوں کرتے ہیں؟ پھر تمھاری ذریت کو پھیلا کر تمھیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا؛ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا اور اس کا لحاظ کرتا ہے۔ لہٰذا لوگوں کے درمیان وجہِ ترجیح اور معیارِ فضیلت ان کے رب کے لیے ان کا تقویٰ ہے۔ بے شک اللہ جانتا ہے کہ اس سے کون زیادہ ڈرتا ہے۔ وہ تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے سے باخبر ہے۔

تقویٰ کے علاوہ اگر کوئی اور شے وجہِ فضیلت بن سکتی ہے تو وہ علم نافع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ يَاۤ اٰدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ، فَلَمَّاۤ اَنْبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۔ (البقرہ ۳۳:)

جب فرشتوں نے اشیاء کے نام بتانے سے اپنے عجز کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے کہا کہ وہ فرشتوں کے سامنے ان اشیاء کے اسماء وصفات کا ذکر کریں۔ ظاہر ہے کہ آدم علیہ السلام کو اللہ نے پہلے ہی ان کا علم دے دیا تھا؛ تاکہ ان کی فضیلت کا اظہار ہو جائے، ان کا مقام واضح ہو جائے اور ان کے انتخاب کی وجہ اور استحقاق واضح ہو جائے۔ جب آدم علیہ السلام نے فرشتوں کے سامنے نام گنوانا شروع کیے تو اس وقت اللہ نے انھیں مخاطب کر کے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ مجھے آسمانوں اور زمین اور ان میں جو کچھ ہے اس کا علم ہے؟ میں ان تمام اعمال و اقوال کو جانتا ہوں، جن کو تم ظاہر کرتے ہو اور ان تمام عقائد و اسرار سے بھی واقف ہوں، جن کو تم پوشیدہ رکھتے ہو۔

اسی سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ یہی وہ واحد صفت تھی جس کے سبب حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر فوقیت حاصل ہوئی اور وہ ان سے افضل وممتاز قرار پائے، پھر یہ بھی غور کرنے کی چیز ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خود اپنی صفت علم کے ساتھ اپنی مدح فرمائی ہے۔ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کو جو تسلیم کیا وہ اس لیے کہ انھیں ان کے اس شرف کا ادراک ہوگیا، جو اللہ نے علم کے ذریعہ انھیں عطا کیا، چناں چہ یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ جسے رفعت اور قدر و منزلت اور بلندی کی خواہش ہو اُسے چاہیے کہ وہ اس علم نافع کو حاصل کرے، جو اللہ نے اپنے رسولوں پر نازل کیا۔ علم نافع کے ذریعہ ہی انسان کو فضیلت مل سکتی ہے، اس کی کمیاں دور ہو سکتی ہیں، غفلت و کوتاہیوں سے وہ بچ سکتا ہے اور بلند مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔

★★★

ماہنامہ

ندائے اعتدال علی گڑھ

جولائی ۲۰۲۴ء | جلد نمبر ۱۶ | شمارہ نمبر ۱ | ذوالحجہ۔محرم الحرام ۱۴۴۵ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ العالی
(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

مجلس ادارات

- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مولانا محمد قمر الزماں ندوی
- مولانا مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی

معاون مدیر

حسن عمار
محمد طارق بدایونی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری 9808850029

شرح خریداری

فی شمارہ: 30:00روپے
سالانہ: 300:00روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ: 500:00روپے
بیرونی ممالک: .... 30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال): 5000:00روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:
مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹرپرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱	قرآن کا پیغام	معیارِ فضیلت	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	
۲	مہمان اداریہ	مایوس نہ ہو	ادہم شرقاوی	۳
۳	فکر و نظر	عیدِ قرباں کا پیغام	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۴
۴	〃 〃 〃	مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۹
۵	〃 〃 〃	قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ء (بہار میں اردو تعلیم و تعلم کا مستقبل)	محمد خالد ضیا صدیقی ندوی	۲۱
۶	〃 〃 〃	حساسیت - اہم ایمانی صفت	محمود محمد الخزندار / عمر محمد غزالی	۲۸
۷	تحقیق و تنقید	اہل کتاب اور مسئلہ کفر و ایمان (ق:۲۷)	مولانا محمد غزالی ندویؒ	۳۲
۸	قضیۂ فلسطین	فلسطین پر مسلمانوں کا دینی، تاریخی اور شرعی حق	محمد انس	۳۹
۹	معاشیات	اسلامی تصور معاش کے فیوض و برکات	محمد انس فلاحی مدنی	۴۷
۱۰	انٹرویو	ملک و ملت کی موجودہ صورت حال کو سوال و جواب کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش	ابو فہد ندوی	۵۶
۱۱	آخری صفحہ	حرام کمائی سے بچو	م-ط-ب	۶۳
۱۲	گوشۂ ادب	غزل	فانی بدایونی	

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہو سکتی ہے۔

مہمان اداریہ

مایوس نہ ہو

وَرُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَيۡكَ۔(النساء:۱۶۴)
(اوران رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کاذکر تم سے نہیں کیا)
اگرلوگ تمھارے فضل وکمال کے معترف نہیں تومایوس نہ ہو!
تمھارے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ،اللہ جانتاہے کہ تم کون ہو!

ہم حضرت نوح علیہ السلام کو جانتے ہیں،اس سے ان کی نیکیوں میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہونے والااور جن نبیوں کے بارے میں اللہ نے ہمیں نہیں بتایاان کی نیکیاں اس وجہ سے کم نہیں ہوں گی کہ تم انھیں نہیں جانتے۔

ہارون رشید کے لشکر میں بیس ہزار مجاہد ایسے تھے جنھوں نے رجسٹر پر اپنانام درج نہیں کرایاتھا!
وہ اپنی تنخواہیں بھی نہیں لیتے تھے، صرف اس لیے کہ اللہ کے سوا کوئی ان کو جان نہ جائے!

سائب بن اقرع نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں معرکۂ نہاوند میں شہید ہونے والوں کی خبر پہنچائی،انھوں نے کچھ بڑے اور معروف افراد کے نام گنائے اور پھر کہا:
اور بھی بہت سے لوگ ہیں،عام لوگ، جن کو امیر المومنین نہیں جانتے،
یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ روپڑے اور فرمایا:
ان کو اس بات سے ذرا بھی نقصان نہیں پہنچنے والا کہ عمر انھیں نہیں جانتا، اللہ رب العزت انھیں اچھی طرح جانتا ہے!

ماخوذ: رسائل من القرآن
تحریر: ادہم شرقاوی
ترجمانی: ابوالاعلیٰ سبحانی

فکرونظر

عید قرباں کا پیغام
عیدالاضحیٰ گزر گئی مگر ہم نے کیا سبق حاصل کیا

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

عیدالاضحیٰ آتی ہے اور گذر جاتی ہے، اس بار بھی آئی اور گذر گئی، کچھ خوش نصیب لوگوں نے اس کے لیے بڑا اہتمام کیا ہوگا، کچھ لبرل لوگوں کے لیے یہ ایک رسم رہی ہوگی جو ادا ہو گئی، کچھ کو اس کی تاریخ سے واقفیت رہی ہوگی، اس لیے انھوں نے بڑے خلوص و جذبۂ شکر کے ساتھ قربانی پیش کی ہوگی، کچھ نے گوشت کھانے کے لیے ہی قربانی کی ہوگی، مگر کی تو ہوگی خواہ دکھانے کے لیے ہی کی ہو، جی ہاں! کچھ بے چارے کئی کئی جانور قربان کرتے ہیں اور تعداد مع قیمت خوب بیان کرتے ہیں؛ مگر ان کے غریب اعزاء و اقارب ایک ایک بوٹی کو ترستے ہیں، خیر اب تو نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ کچھ لبرل قربانی کو ہی بے سود اور فضول سمجھنے لگے ہیں، ان کی نظر میں اس قدر خون بہانے سے بہتر ہے کہ یہ رقم صدقہ کی جائے، تعلیم پر خرچ کی جائے اور دوسرے قومی و رفاہی کام کیے جائیں، ظاہر ہے کہ یہ بے چارے عقل مند، بلکہ عقل کے مارے جس طرح قربانی کے سماجی و اقتصادی فوائد اور رفاہی پہلو سے واقف نہیں اسی طرح ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ قربانی کے دنوں میں اللہ کو خون بہانے سے زیادہ کوئی اور عمل پسند ہی نہیں، حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے:

عن عائشة رضي الله عنها أنّ رسول الله ﷺ قال: ما عمل آدميّ من عمل يوم النحر أحب إلى الله من إهراق الدم، إنه ليأتي يوم القيامة بقرونها وأشعارها وأظلافها وإن الدم ليقع من الله بمكان قبل أن يقع من الأرض، فطيبوا بها نفساً۔ (رواه الترمذي، ۱۴۹۳، أبواب الأضاحي)

(حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا: یوم النحر کو ابن آدم کا کوئی بھی عمل خون بہانے سے زیادہ اللہ کے نزدیک محبوب نہیں، اور قربانی کا جانور اپنے سینگ، کھر، اور بالوں کے ساتھ قیامت کے دن آئے گا، اور بے شک وہ خون کے زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے یہاں مرتبہ حاصل کر لیتا ہے، پس اس کو خوش دلی سے انجام دو)۔

حقیقت میں یہ قربانی بندے کے لیے اللہ سے تعلق کے اظہار کا ذریعہ اور اس کی علامت ہے، اس کے خون اور گوشت سے خدا کو کوئی سروکار نہیں، اس کی بارگاہ میں تو وہی تعلق، وہی اخلاص اور وہی نیت پہنچتی ہے جس کے اظہار کے لیے یہ قربانی پیش کی جاتی ہے۔ اسی کا ارشاد ہے:

لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔ (الحج: ۳۷)

(اللہ تک ان جانوروں کا نہ خون پہنچتا ہے اور نہ گوشت، اللہ تک تو تمہارا تقوی پہنچتا ہے (اللہ کے یہاں تمہارے خلوص اور تقوی کی اصل قدر ہے)۔

یہ قربانی ایک ایسے قرآنی قصہ کی یادگار ہے جو امتحان وآزمائش کی اعلیٰ ترین مثال ہے،اس میں حکم الٰہی کے سامنے دو نبیوں کے سرِ تسلیم خم کرنے کی ایسی مثال بیان کی گئی ہے،ان کے صبر واستقامت اور طاعت الٰہی کا ایسا واقعہ سنایا گیا ہے، جو خالق کائنات کو کچھ اس طرح بھایا کہ اُسے رہتی دنیا تک کے لیے یادگار بنادیا،امت اسلامیہ کے ایک فرد کی حیثیت سے ضروری ہے کہ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کے اس واقعہ سے واقفیت حاصل کی جائے،ملت ابراہیمی کی طرف نسبت ہے تو اس نسبت کی اہمیت کو سمجھا جائے، یہ قربانی بھی تو ملت ابراہیمی کا شعار ہے،اسی ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کو حکم دیا تھا: ثم اوحینا إلیك أن اتبع ملة ابراهيم حنيفا وما كان من المشركين۔ (النحل:۱۲۳)،(پھر ہم نے تمھیں پیغام دیا کہ اللہ کے لیے یکسو ہو کر ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو، اور ان کی طرز حیات کو اختیار کرو، وہ شرک کرنے والے نہیں تھے)۔اس ملت ابراہیمی سے اعراض کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے احمق وبے وقوف قرار دیا تھا، ومن یرغب عن ملة إبراهيم إلا من سفه نفسه ولقد اصطفينه في الدنيا وإنه في الآخرة لمن الصالحين۔ (بقرہ:۱۳۰) (ابراہیم کی ملت اور ان کے طور وطریق سے اعراض کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جو خود اپنے تئیں احمق وسفیہ ہو، ہم نے دنیا میں ان کا انتخاب کیا،اور آخرت میں وہ ان لوگوں میں ہوں گے، جنھوں نے بالکل درست روش اختیار کی)۔اسی ملت ابراہیمی کے اتباع کو اللہ نے حسنِ اسلام اور غایتِ تدین کی علامت بنایا تھا: ومن احسن دينا ممن أسلم وجهه لله وهو محسن واتبع ملة ابراهيم حنيفا وما كان من المشركين۔ (نساء:۱۲۵) (اس سے بڑھ کر بہتر دینداری کس کی ہے ؟جو اپنے کو نیکوکاری کے ساتھ اللہ کے حوالہ کردے،اور ملت ابراہیمی کا اتباع کرے،جو اللہ کے لیے یکسو تھے،اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل (اپنا محب ومحبوب) بنایا)۔اسی ملت ابراہیمی کی طرف اللہ نے اپنے نبی کو ہدایت دی تھی: قل إنني هداني ربي الى صراط مستقيم دينا قيما ملة ابراهيم حنيفا وما كان من المشركين (انعام:۱۶۱)،(کہہ دیجئے کہ میرے رب نے صحیح راستے کی طرف میری رہنمائی کی ہے، صحیح دین، صحیح نظام اطاعت اور ملت ابراہیمی کی جو مکمل طور پر اللہ کے لیے یکسو تھے،اور وہ شرک کرنے والے نہیں تھے)،اسی ملت ابراہیمی کے اتباع کا سب کو حکم دیا تھا: قل صدق الله فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفا وما كان من المشركين (آل عمران:۹۵)، (کہہ دیجئے کہ اللہ نے سچ کہا؛ ابراہیم کی ملت کا اتباع کرو، وہ اللہ کے لیے یکسو تھے، وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے)۔ چنانچہ جب یہ قربانی اس ملت ابراہیمی کا شعار ہے تو پھر لازم ہے کہ اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی جائے،اور یہ بھی نہ ہو کہ قربانی تو کی جائے، مگر اس کے مقاصد،اس سے حاصل ہونے والے سبق کو فراموش کردیا جائے، خود عید کے مقاصد سے ہی نابلد رہا جائے،قربانی تو کی جائے، مگر قربانی کے علاوہ بقیہ شعبہائے زندگی میں ملت ابراہیمی کے اتباع کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور موقف ابراہیمی کے خلاف زندگی گذاری جائے، شعائر اسلامی کی پامالی پر دل بھی نہ دکھے، زبان سے آہ بھی نہ نکلے، کفر و شرک سے اظہار براءت اس کے غلبہ اور اس کی ہمنوائی کرنے والوں کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت بھی نہ ہو سکے، ملت ابراہیمی سے نسبت کا تقاضا ہے کہ حضرت ابراہیم کا وہ کردار جو ایثار، جرأت، حکمت، بے باکی وحق گوئی اور ببانگ دہل توحید

باری کے اعلان سے عبارت ہے ہمارے سامنے ہو۔

عید در حقیقت اسلام میں اجتماعیت اور اسلامی تشخص کی علامت اور مظہر ہے، مسلمانوں کی عید ان کو دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہے، وہ ایک عید بطور شکرانۂ الٰہی مناتے ہیں تو دوسری عید میں بارگاہ الٰہی میں قربانیوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، انھیں اس کی قطعاً اجازت نہیں کہ وہ عید کی خوشی میں حدود شریعت سے باہر نکل جائیں، فسق و فجور کی محفلیں سجائیں، جوئے اور ناچ گانے میں مست ہو جائیں، لباس، خوشی اور عید کی پارٹی کے نام پر بے حیائی، فحاشی اور مغربی تہذیب کی نقالی سے عید کے تشخص کو برباد کر دیں، کیوں کہ ان کی عید دوسروں کی عید سے ممتاز، مغائر، ممیز، پاکیزہ، سنجیدہ و باوقار اور بہت بہتر ہے، جیسا کہ خود نبی کریمؐ نے اہل مدینہ سے فرمایا تھا کہ تمہارے یہ جو دو دن کھیل کود کے لیے مختص ہیں، ان کو اللہ نے یوم الفطر اور یوم الاضحی سے تبدیل کر دیا ہے جو ان دونوں سے بہتر ہیں، ''قدم رسول اللهﷺ المدينة ولهم يومان يلعبون فيهما، فقال: ما هذان اليومان؟ قالوا: كنا نلعب فيهما في الجاهلية، فقال رسول اللهﷺ إن الله قد أبدلكم بهما خيرا منهما يوم الاضحى ويوم الفطر''۔

اس حیثیت سے یہ بات سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں کی عید دین کا مظہر ہے، دین کا شعار ہے، اس کی تعظیم و احترام لازم ہے، عید میں بھی شعائر دین کی تعظیم کا لحاظ رکھنے، اجتماعی بنیادوں کو استوار کرنے اور اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ عید در حقیقت اپنے دینی تصور کے اعتبار سے محض شکرانۂ نعمت اور شکر الٰہی کا مظہر ہے: ولتكملوا العدة ولتكبروا الله على ما هداكم ولعلكم تشكرون۔ (بقرہ: ۱۸۵)، (اور یہ مقصود ہے کہ تم روزوں کی تعداد پوری کرو، اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو ہدایت دی ہے اس پر عظمت و کبریائی کے گن گاؤ اور تاکہ تم (اس کی نوازشوں کا) شکر ادا کرو)۔

عید کے اجتماعی، معاشرتی اور انسانی پہلو کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے، بچوں کو عید کا انتظار رہتا ہے، عید کی آمد سے وہ کھل اٹھتے ہیں، یہ در حقیقت ان کی خوشی کا دن ہوتا ہے، فقراء و مساکین عید کا انتظار کرتے ہیں، ان کو اصحاب ثروت کی طرف سے کچھ مدد مل جاتی ہے، اب اگر بڑے بچوں کی خوشی کا لحاظ نہ کریں، اغنیاء و فقراء کی طرف توجہ نہ کریں تو گویا عید کا یہ پہلو ان کے سامنے نہیں تھا یا پھر عید کا یہ سبق وہ بھول گئے، عید اتفاق و اتحاد پیدا کرنے، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے، رشتوں کی شیرازہ بندی کرنے، عفو و درگذر کا مظاہرہ کرنے، بغض و حسد سے نجات پانے اور نفرتوں کو الفتوں میں تبدیل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، عید کی انسانی اور اجتماعی حیثیت اس ناحیہ سے بہت اہم ہے، کہ عید کے دن اغنیاء طبقہ و خیرات، ہدایا و تحائف اور قربانی کے گوشت کے ذریعہ اپنے اموال سے فقراء کو دینے کا سبق یاد کریں، معاشرے کے کمزوروں پر شفقت و محبت و رحمت کی نگاہ ڈالیں اور کیا خوب ہو کہ مالدار کمزوروں کے ساتھ اس طرح پیش آئیں جیسے اللہ نے ان پر نوازشات کی بارش کی ہے، جیسے اللہ نے ان کو دولت سے مالامال کیا ہے، نعمتوں سے نہال کیا ہے، اللہ نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: أحسن كما أحسن الله إليك ولا تبغ الفساد في الارض إن الله لا يحب المفسدين۔

(القصص:۷۷)(اچھا معاملہ کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ اچھا معاملہ کر رکھا ہے اور زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو، اور اللہ تعالیٰ فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔ اگر عید کے اس انسانی پہلو کو عمل میں لایا جائے تو عید کی خوشی سے ہر گھر سرشار ہوگا، ہر خاندان عید کا لطف لے گا اور اس طرح اسلامی عبادات کا انسانی و اجتماعی پہلو غیروں کے سامنے آکر ان کے لیے باعث کشش اور خاموش دعوت ہوگا۔

عید پر اس پہلو سے بھی غور کیجئے، قرآن مجید کا بیان ہے: إن هذه امتكم امة واحدة وأنا ربكم فاعبدون (انبیاء:۹۲)۔ (یہ تمہاری امت ایک امت ہے، اور میں تمہارا رب ہوں، پس میری بندگی کرو)۔ ذرا دیکھیے کہ عید کے دن پوری امت مسلمہ کس طرح امت واحدہ ہونے کا شعوری یا غیر شعوری طور پر پیغام دیتی ہے، کس طرح سب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں، گلے شکوے دور کرتے ہیں، ایک دوسرے کو کثرت سے ہدایا دیتے ہیں، اس موقع پر بسا اوقات ہدایا کا تبادلہ کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ اپنی ہی چیز گھوم پھر کر واپس آجاتی ہے، اخلاص کی جس قدر فضیلت آئی ہے اس کی مٹھاس بڑی حد تک اس دن محسوس ہوتی ہے، یوں تو بے شمار فضیلتوں کے باوجود پڑوسیوں کے حقوق پر توجہ نہیں دی جاتی، مگر عید کے دن پڑوسیت کی حِس بھی جاگ جاتی ہے، یہ الگ بات کہ بعض بدنصیب شہر ایسے بھی ہیں، جہاں مسلمان اس دن بھی سات دروازوں میں کنڈی لگا کر گھر کے دربے میں بند رہتے ہیں، اس قدر اندر بیٹھ کر وہ دوسروں سے ملنے کے بجائے لوگوں کی آمد کا انتظار کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اگر عید کے اس پہلو پر شعوری طور پر عمل کیا جائے تو پوری امت انعام الٰہی کا مصداق ٹھہرے گی، کیوں کہ سب کے سب امت کی اجتماعیت کو قائم کرنے میں اپنا حصہ ڈالیں گے، افراد ملت میں اجتماعیت کا احساس پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کریں گے إنما المؤمنون اخوة کی تعبیر و تفسیر عملاً پیش کرنے کی کوشش میں شامل ہوں گے، اگر یہ کام کیا جائے اور شعوری طور پر کیا جائے تو یہ بڑے پیمانے پر اصلاح ذات البین کا بھی ذریعہ بن سکتا ہے، معاشرے میں اخوت و محبت کی جڑیں مضبوط کر سکتا ہے اور بڑے پیمانے پر موثر انداز میں اس پیغام کو اس طرح عام کیا جا سکتا ہے، انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بين اخويكم واتقوا الله لعلكم ترحمون۔ (الحجرات: ۱۰)۔ (تمام ایمان والے بھائی بھائی ہیں، اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرایا کرو، اور اللہ کا لحاظ رکھا کرو (اس کی شریعت کی پابندی کیا کرو) تاکہ تم پر وہ رحم فرمائے۔

جب اخوت اسلامی کا یہ احساس پیدا کیا جائے گا تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ دوسروں کے درد کو محسوس کریں گے، دوسروں کی تکلیف سے انھیں تکلیف محسوس ہوگی، پھر وہ خود کو فرد ملت سمجھیں گے اور ملت پر ٹوٹنے والے آلام و مصائب کو عید کی خوشی اور دعوتوں کی لذت اور کباب و قورمہ کی کشش میں فراموش نہیں کریں گے، اس امت کو اللہ نے خیر امت بنایا ہے، امت وسط بنایا ہے، اس لیے اس کے ہر کام میں خیر نمایاں اور اعتدال کا اظہار ہونا ضروری ہے، اس امت کے اہل ایمان کی خصوصیت جناب رسالت مآب ﷺ نے یوں بیان فرمائی ہے: مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم كمثل الجسد الواحد إذا اشتكى منه عضو واحد تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى۔

(مسند احمد/۴۳/۷۳۱۸۳، الطبعۃ الاولی ۱۹۹۹ء)، (آپسی محبت وہمدردی اور شفقت میں مؤمنین کی مثال ایک جسم کی طرح ہے، کہ جب جسم کے کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پورا بدن بے خوابی اور بخار کا شکار ہوتا ہے) اس امت کے خیر امت اور امت وسط ہونے کے اعتبار سے لازم ہے کہ خوشی وغمی، تنگ حالی وخوش حالی، مصیبت وفرحت کا کوئی موقع ہو، مگر اس کا اعتدال نمایاں ہو کر سامنے آئے، ایک طرف اگر عید کے موقع پر عید کی خوشیوں سے لطف اندوز ہو تو دوسری طرف محرومِ دنیا کو خوشی میں شریک کرے، اور نظر فلسطین وشام اور دیگر مسلم ممالک کے مظلوم ومقہور وبے بس مسلمانوں کی محرومی پر رکھے اور زبان سے ان کے لیے دعا کرے کہ اللہ ان کے مصائب دور کر دے اور آئندہ عید ہماری طرح ان کے لیے بھی خوشیوں بھرا پیغام لے کر آئے۔

عیدیں آتی ہیں گذر جاتی ہیں، اسی طرح اس مرتبہ بھی عید قرباں آئی اور گذر گئی، مگر سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم نے اس کے پیغام کو سمجھا، کیا عید ہمارے لیے شعور کی بیداری، جذبۂ اخوت ومحبت کو جنم دینے کا ذریعہ بنی، کیا ہماری عید اس طرح مظہر اعتدال ووسطیت بن سکی کہ ہم اپنی خوشی کا اظہار بھی کریں اور دوسرے بھائیوں پر مظالم ومصائب کو بھی محسوس کر سکیں، کیا ہم نے معاشرے کے کمزوروں کو اپنے دستر خوان پر بلایا، کیا ہم ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان سے ملنے گئے، کیا ہم نے غریبوں کی مدد کی، ان کے گھر بھی اچھا کھانا پک جائے، اس کی فکر کی، گھر کے نوکر کے بچے بھی نئے کپڑے پہن لیں اور ہمارے بچوں کی طرح خوشی منالیں، یہ احساس جاگا، کیا ہمارے اندر ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام کی ملت کے اتباع کا احساس جاگا، کیا ان کے صبر واطاعت واستقامت اور راہ خدا میں حکم الہی کے سامنے اپنی ہر چیز قربان کر دینے کے واقعہ سے ہمارے اندر بھی اطاعت واستقامت کا کچھ جذبہ پیدا ہوا، یا یہ عید بھی گوشت کھانے پکانے اور قربانی کے جانور کے محفل در محفل تذکرے کرنے میں گزر گئی، اگر اب تک ہم نے غور نہیں کیا ہے، قربانی کی حقیقت، عید کے پیغام محبت واجتماعیت اور اس کے معاشرتی و انسانی پہلو کو نہیں سمجھ سکے ہیں تو پھر ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ آئندہ عید آنے سے قبل ہم اپنے اور اپنے اہل خانہ کے اندر یہ روح پیدا کرلیں، تاکہ آئندہ ہماری صحیح معنی میں عید ہو سکے اور ہم انفرادی طور پر عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی احساس کو فروغ دینے اور مقاصد عید کو عام کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔

☆☆☆

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

جگر مرادآبادی

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

(نوٹ: یہ مضمون دراصل مدیر محترم نے اپنی کتاب مفکر اسلام ایک مطالعہ پر بطور مقدمہ سپردِ قلم کیا تھا، پھر اسی تحریر کو کچھ تبدیلی کے ساتھ مولانا پر ہونے والی بے نظیر عالمی کانفرنس کے اردو مقالات کے مجموعہ ''مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ-اپنے افکار کے آئینہ میں'' کا مقدمہ بنا دیا تھا۔ اس میں حضرت مفکر اسلام کی شخصیت کو جس جامعیت کے ساتھ اور لائق تقلید نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اس کے پیشِ نظر اس مضمون کو افادۂ عام کی غرض سے قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔ ادارہ)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی جس وقت اس دار فانی سے رحلت ہوئی تو یہ ایک عام تاثر پایا گیا کہ ملت اسلامیہ ایک عظیم، جرأت مند و بے باک اور دینی غیرت و ایمانی حمیت سے سرشار و مخلص اور حق گو داعی سے محروم ہو گئی ہے، اور بالخصوص ہندوستان کی ملت اسلامیہ یتیم ہو کر رہ گئی ہے، میری ناقص نظر میں مولانا اس سلسلہ میں یکتا تھے کہ ایک طرف اخلاص کی دولت سے مالا مال، ملی تڑپ ان کے سینہ میں موجزن، علم و مطالعہ سے ان کی زندگی عبارت، سلوک و تزکیہ میں کندن بنی شخصیت، وسیع نظر اور بیش قیمت تجربات کا سرمایہ ان کے پاس تھا، دینی غیرت اور ایمانی حمیت آپ کا سرمایۂ افتخار تھی، خم ٹھونک کر حق کا اظہار آپ کا طرۂ امتیاز تھا، مولانا کی پوری زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؒ نے ہمیشہ مذہبی مفاد، دین کی بالادستی، ملی مفاد اور حق گوئی کو اپنا شعار بنایا اور کبھی بھی اس میں کسی فرد و ادارے یا شہرت و جاہ طلبی اور ادنی درجہ کی مادیت پسندی یا اور کوئی مصلحت حائل نہ ہوئی، درحقیقت مولانا کے اخلاص و استغناء میں ہی ان کی جرأت و حق گوئی کا راز مضمر ہے۔ موجودہ حالات میں مولانا کی خود نوشت پڑھتے ہوئے بار بار زباں پر یہ شعر آ جاتا ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے　　　　کہ زندگی ہی عبارت ہے تیرے جینے سے

جامعیت کے ساتھ خانقاہ و مدرسہ، ملی مسائل و عصری جامعات اور علمی و تصنیفی میدان ان کو اپنی دعوتی سرگرمیوں کی جولانگاہ بنایا، وفات کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا مذکورہ بالا شعر (جو خود مولاناؒ نے ایک جگہ ذکر کیا ہے) اپنی معنویت کا احساس دلانے لگا، کہ وہ بے لوثی، وہ اضطراب و تڑپ، وہ اخلاص اور فکر و عمل جس سے مولانا کی زندگی عبارت تھی، ان کی زندگی اسی زندہ دلی کا سحر انگیز نتیجہ تھی، اب وہ زندہ دلی ہی نہیں نظر آتی تو مولاناؒ جیسا بلند کردار، ان کے جیسی جرأت گفتار، ملی مسائل پر تڑپ جانے اور تڑپا دینے کا وصف اور وسیع القلبی و وسیع النظری کہاں نظر آئے۔

اب تک مفکر اسلامؒ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور مختلف زبانوں میں لکھا گیا ہے، ان کے منہج تنقید پر اور ان کے ادبی نظریہ پر عربی میں ایم، فل و پی، ایچ، ڈی کے مقالے لکھے گئے، عبدالقادر چوغلے (ساؤتھ افریقہ) کی دو ضخیم

کتابیں انگریزی میں شائع ہوچکی ہیں۔

مولاناؒ کی خدمات وحیات پر اور بھی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، عالم اسلام کی ایک مؤثر شخصیت مجاہد وقت وچراغ سحر ڈاکٹر یوسف القرضاوی حفظہ اللہ نے انتہائی محبت واحترام میں اپنے قلم کو ڈھل کر اپنی تصنیف "ابوالحسن الندوی کما عرفتہ" پیش کی، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ نے سب سے پہلے ایک جامع کتاب "میر کارواں" پیش کی، جوان کے قلم کی روانی، اسلوب کی شگفتگی اور حقائق نویسی میں ممتاز ہونے کے ساتھ سوانحی ادب میں گراں قدر اضافہ ہے، مولاناؒ کے جانشین، سفر وحضر کے رفیق اور طویل رفاقتوں میں قریب سے دیکھنے والے متاع عہد آخر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب نے بھی "مولانا علی میاں عہد ساز شخصیت" کے نام سے مولانا کی حیات پر مفصل کتاب پیش کی، اس کے علاوہ عربی میں نوجوان فاضل سید عبدالماجد غوری نے بھی ضخیم ومعلوماتی کتاب تیار کی، پرفیسر محمد اجتباء ندویؒ، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، مولانا سید محمد واضح رشید ندوی کی کتابیں بھی لائق استفادہ ہیں، مولانا کے فکری پہلوؤں پر متعدد مجموعۂ مقالات اور کتابوں میں ترکی عبد مجید السلمانی کی کتاب "الفكر والسلوك السياسي عند ابي الحسن الندوي" اور احمد الوشمی کی "منهج النقد عند أبي الحسن" لائق مطالعہ ہیں، مولانا کے افکار ودعوت کو سمجھنے کے لئے ان کے ہی فرد خاندان مولانا بلال عبدالحی حسنی صاحب کی کتاب "حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دعوت وفکر کے اہم پہلو" کافی ضخیم ومفصل ہونے کے ساتھ بہت مفید ہے، کیا ہی خوب ہو کہ اسکو عربی میں منتقل کرکے عالم عربی میں عام کیا جائے، یہ کتاب ۱۶ ابواب پر مشتمل ہے، مولانا کے تقریبا تمام افکار اور خدمات کا احاطہ کرتی ہے، اس کے علاوہ متعدد سیمیناروں کے مجموعے بھی شائع ہوئے، اس میں قابل ذکر شعبۂ عربی اور شعبۂ دینیات علی گڑھ کا سیمینار کا مجموعہ مقالات ہے، دہلی یونیورسٹی کے سیمینار کا مجموعہ مولانا کی تصنیفات پر لکھے گئے تحلیلی وتجزیاتی مقالات پر مبنی ہے اس کو پروفیسر محسن عثمانی نے مرتب کرکے شائع کیا ہے ایک ضخیم مجموعۂ مقالات "أبو الحسن الندوي بحوث ودراسات" کے نام سے رابطہ ادب اسلامی نے شائع کیا تھا، یہ ۱۹۹۶ء میں رابطہ کی جانب سے مولانا کی تکریم میں منعقد کیے جانے والے ترکی کے سیمینار کے قیمتی مقالات کا مجموعہ تھا، جس میں ان کی ادبی خدمات پر ادب کی نوک پلک درست کرنے والوں نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے، اب ہمارا یہ مجموعہ مقالات "مفکر اسلام اپنے افکار کے آئینہ" میں شائع ہورہا ہے ایک جزو "موقف الشيخ ابي الحسن الندوي من الأفكار المعاصرة" پہلے ہی چھپ چکا ہے، زیر نظر مجموعہ مقالات سے مولانا کے افکار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، اس سے واضح ہوگا کہ آپ فی الحقیقت داعی تھے، آپ نے اپنا اصل میدان عمل عربوں کو بنایا تھا لیکن ہندوستان سے بھی آپ غافل نہیں ہوئے، اس کتاب میں قاری کو مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلو نظر آئیں گے، ان کا مجاہدانہ کردار نظر آئے گا، ان کی جرأت گفتار، صریح تنقیدیں واضح مشورے، اصلاح وتغیر کے عمل میں حرکت وپیش قدمی، ملی تڑپ، مسائل کے حل کی تلاش میں تگ ودو اور اخلاص و بے لوثی کی تصویریں بھی نظر آئیں گی، بے اخلاصی وبے لوثی اور مادیت پسندی وجاہ طلبی بلکہ شہرت طلبی کے اس دور میں مولانا کے کردار کی معنویت بھی سامنے آئے گی، لوگوں کو برتنے کا انداز، تمام تر مفادات سے بالا ہوکر اپنی ساری زندگی کو اسلام کی

خدمت میں لگادینے اور کسی پل بھی خالی اور چین سے نہ بیٹھنے کی ایک موئثر و متحرک اور دلکش و دلآویز تصویر کا بھی دیدار ہوگا، میری نظر میں اس کوشش سے ایک طرف تو مولانا کے افکار و انداز کی اشاعت و وضاحت ہوگی تو دوسری طرف اس عہد میں مولانا کے افکار، ان کی کوششوں اور طریقۂ عمل کی معنویت و ضرورت اور اہمیت بھی اجاگر ہوگی اور اس کا اندازہ ہوسکے گا کہ ان حالات میں اس تڑپ، حرکیت و جامعیت اور بے لوث خدمت کی کس قدر ضرورت ہے، اور اصلاح کی غرض سے جرأت مندانہ تنقیدوں کی کس قدر ضرورت ہے، سچ یہ ہے کہ اس مجموعہ میں قاری کی متنوع معلومات یکجا نظر آئیں گی۔

واقعہ یہ ہے کہ مولاناؒ جس جامعیت کے حامل و داعی تھے اس کو کسی ایک کتاب میں جمع کرنا بہر حال مشکل ہے، لیکن ہمارے ان دو مجموعۂ مقالات میں مولانا کی جامعیت کی بڑی واضح تصویر نظر آئے گی۔

مولاناؒ جس جامعیت کے حامل تھے اس کے سبب ان کے تصنیفی شوق کو کبھی بھی دعوت و تبلیغ کے فریضہ نے رکنے نہ دیا اور نہ ہی اس کے برعکس ہوا کہ ان کی دعوتی زندگی علمی فرائض کی ادائیگی سے متأثر ہوئی ہو، تقریری و تحریری عمل ایک ساتھ جاری تھا، علمی انہماک اور دعوتی سرگرمیوں کے ساتھ اجتماعی مسائل سے کبھی بچنے کی کوشش نہیں کی، گوشۂ عافیت کو ملی مسائل پر کبھی حاوی نہ ہونے دیا، ضرورت وبساط بھر ملک و ملت کے لئے سیاسی کوششیں بھی کیں، کہ مولانا ہی کے الفاظ میں ’’تعمیری سیاست کے ذریعہ ملت کے تحفظ میں حصہ لینا ضروری ہوتا ہے‘‘ مولانا کی یہی جامعیت تھی جس نے ان کو ہر دل عزیز و مثالی کردار کی حامل شخصیت بنادیا۔

حضرت مولاناؒ ابتدا میں جماعت اسلامی سے متعلق ہوئے، پھر تبلیغی جماعت سے تعلق ہوا بلکہ اس فکر و دعوت کو دنیا بھر میں عام کرنے میں آپ کا بڑا حصہ رہا، آخر تک مولانا نے اس سے اپنا تعلق باقی رکھا اگرچہ اصولی طور پر اس سے خاموشی کے ساتھ علیحدگی اختیار کر لی تھی، جماعت اسلامی سے علیحدگی اور مولانا مودودیؒ سے بعض اختلافات کے باوجود کبھی کوئی ایسی بات زبان پر نہ آئی جو فکری اختلاف سے آگے بڑھ سکے، مولانا نے ان دونوں طریقہائے دعوت کے درمیان سے ایک اور راستہ اختیار کیا اور سب کو ساتھ لے کر اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ساری زندگی مصروف عمل رہے، آپ نے امراء و ملوک، علماء و دانشوران اور عوام الناس کے ہر حلقہ میں اپنی دعوت پہنچانے کی کوشش کی اور ہر طبقہ کو اپنا مخاطب سمجھا اور کسی حد تک متأثر بھی کیا، ابتداء سے ہی مولانا نے انقلابی طبیعت پائی تھی جس کا اظہار آخر تک حرکیت کی شکل میں بار بار ہوتا رہا اور جس کی جھلک ’’کاروان زندگی‘‘ کی آخری جلد میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

مولانا کی زندگی سے یہ سبق ملتا ہے کام کرنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی، بس اس کے لیے کردار، تڑپ اور اخلاص درکار ہے، آزادی کے بعد متصلاً جب کبار علماء ملک میں موجود تھے، اور مولانا نوجوان تھے تب بھی مولانا کو ملک کی صورت حال نے بے چین کیا تو ’’نشان راہ‘‘ کے عنوان سے ایک مضمون تیار کیا اور ندوۃ العلماء میں ایک اجتماع بلایا اور مستقبل میں ملت اسلامیہ کے مسائل پر گفتگو کی، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ کسی بات کو کہنے کے لئے وہ مقام، وہ عمر و مرتبہ چاہیے جہاں سے کوئی تبصرہ کیا جاسکے اور کوئی بڑی اور حق بات کی جاسکے، کسی حد تک بجا اور بالکل بجا! لیکن جب مصلحت پسندی اور سچ یہ ہے

کہ سکوتِ بے جا اور اپنے آپ میں گم رہنے کی روش عام ہو جائے تو پھر کیا کیا جائے، کوئی تو ہو جو حق گوئی کرے اور حق کا غلغلہ ہر جگہ بلند کرے، مولانا نے بے شمار ایسے نقوش چھوڑے ہیں کہ اخلاص وانابت اور جرأت مومنانہ کے ساتھ اصلاح وحق گوئی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، ہمیشہ حکمت کے ساتھ مدلل انداز میں حق بات کہی جائے، ابتدائی عملی زندگی میں تو یہ نقوش ملتے ہی ہیں، آخری عمر میں امراض وضعف بھی ملی مسائل میں اس حق گوئی اور مواقع تلاش کر اپنی بات کہنے کے عمل سے نہ روک سکے، علم وادب کی وادیوں کو سیراب کرنے کے ساتھ خانقاہ کو آباد کرنا اور اجتماعی و ملی مسائل میں دلچسپی لینا ہی مولاناؒ کا وصف امتیازی ہے۔

وہ ہمیشہ دعوت واصلاح کے مواقع ڈھونڈا کرتے تھے، بسا اوقات تو طبیعت کے آمادہ نہ ہونے کے باوجود مختلف مجالس اور کانفرنسوں میں صرف اس جذبہ سے مجبور ہو کر شرکت کرتے تھے کہ حکومت کے نمائندوں اور امت کے منتخب مجمع کے سامنے ایمانی دعوت پیش کرنے اور اصل حقائق کو واشگاف کرنے کا یہ موقع کہیں ہاتھ سے نہ چلا جائے، اندرون کتاب پیش کئے گئے اقتباسات میں اس کی دلیل ملے گی، مولانا کے یہاں حکمت اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ اپنی پوری بات پیش کرنے کی بے شمار مثالیں ہیں، مولانا اکثر جب کسی پر تنقید کرتے، اس کے کمزور پہلوؤں پر انگلی رکھتے اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے تو اس سے قبل وہ اسکی خدمات کو سراہتے اور اس کی اچھائیوں کو پیش کرنے کے قائل تھے، بدقسمتی سے علمی انحطاط کے اس دور میں بہت سے لوگ اس انداز کو سمجھ نہیں پائے اور اسکو مدح وتوصیف سمجھ بیٹھے، اسی لیے بہت سے لوگوں کو میں نے خود کہتے ہوئے سنا اور لکھتے دیکھا کہ مولانا عرب کے بعض حکام (خواہ وہ نااہل ہوں) کی تائید کرتے تھے، سعودیہ سے ان کا دوستانہ تعلق تھا، ہر موقع پر انہوں نے اس کے موقف کی تایید کی، یہ سراسر غلط اور حقیقت فہمی سے دور ہونے پر مبنی خیال ہے، مولانا نے ہمیشہ حکام سے ملاقات ومراسلت ان کی اصلاح کے لئے کی، تاکہ ان تک دین اور دینی دعوت پہنچائی جاسکے، مولانا کے خطوط وخطابات اس پر دلالت کرتے ہیں، جن کے اقتباسات جابجا اندرون کتاب نظر آئیں گے، مولانا کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود بھی صریح تنقید پر مبنی بعض مضامین پر خود حکومت سعودیہ نے حکم امتناعی نافذ کیا اور مملکت میں ممنوع قرار دیا، مولانا ہمیشہ حکمرانوں کو عمر بن عبد العزیز اور صلاح الدین ایوبی کی مثال دیا کرتے تھے۔

در حقیقت مولانا کا اخلاص، بے لوثی اور استغناء اس درجہ کا تھا کہ اس نے انہیں نقد واصلاح کی مکمل آزادی دے رکھی تھی، کبھی وہ اپنے یا اپنے افراد خاندان اور اپنے ادارے کے لئے کوئی سوال نہ کرتے، حتی الامکان آسانی کے ساتھ کسی سے کچھ قبول نہ کرتے، بلکہ کانفرنس وغیرہ میں جاتے تو بھی منتظمین کے ذریعہ مہیا کرائی گئی قیام وطعام کی اعلیٰ سہولیات کو نظر انداز کر کے اپنے اہل تعلق کے یہاں قیام وطعام کو ترجیح دیتے اور حجاز کے سفر میں تو بیشتر یہی معمول رہا، جہاں یہ خدشہ ہوتا کہ اس سے اپنی بات کہنے یا کہنے کے بعد سننے والے پر اثر پڑنے میں کمی ہو سکتی ہے وہاں تو خاص خیال رکھتے اور آخری درجہ کے استغناء کا مظاہرہ کرتے اگرچہ یہ استغناء آپ کی عادت ثانیہ تھی، آج کی مجبوری یہ ہے کہ بسا اوقات غلط کو غلط صرف اس لیے نہیں کہا جاتا یا صحیح کی تصدیق صرف اسلئے نہیں کی جاتی کہ مولانا جیسے اصحاب دل حضرات کی سیرت کو محض واقعات و

عقیدت کی بنا پر پڑھ لیا جاتا ہے، ذاتی و خاندانی مفادات پر ملی و اجتماعی مفادات کی ترجیح اور استغناء و بے لوثی یوں تو عنقاء ہو چکی ہے، بڑے بڑے ادارے اور تحریکیں ان کے فقدان کا شکار ہو کر رہ گئی ہیں، بلکہ بسا اوقات تو محسوس ہوتا ہے کہ ان خصوصیات کا فقدان بر وقت اقدامات اور لازمی کوششوں، ابطال باطل اور تائید حق سے بھی روک دیتا ہے، حضرت مولاناؒ کے استغناء و بے لوثی کا یہ عالم تھا کہ شاہ فیصل سے ملاقات ہوئی، آپ نے بڑی مؤثر گفتگو کی یہاں تک کہ شاہ فیصل کی چیخیں نکل پڑیں، ملاقات کے اختتام پر شاہ فیصل نے ندوۃ العلماء کے لیے ایک خطیر رقم کی پیش کش کی تو مولانا نے اس کو نظر انداز کر دیا، شاہ فیصل ایوارڈ لینے تک نہ گئے، بلکہ مصلحتاً اس کو قبول کیا اور ساتھ ہی اس کے دعوت اسلامی اور دینی تعلیم سے متعلق اداروں میں تقسیم کا اعلان کرا دیا اور کمال حیرت ہیکہ اس رقم کا ادنیٰ حصہ بھی ہندوستان نہ آنے دیا، دبئی اور برونائی کا ایوارڈ بھی بڑے اصرار کے بعد قبول کیا اور ساری رقم اداروں اور تنظیموں میں تقسیم کر دی، چندر شیکھر اور نرسمہا راؤ نے پدم بھوشن کی پیشکش کی، نرسمہا راؤ نے خود فون کر کے پیشکش کی لیکن مولانا نے اس کو خوبصورتی کے ساتھ ٹال دیا، ۱۹۸۰ء میں شاہ فیصل ایوارڈ ملنے کے بعد اسی سال دار المصنفین میں مولانا کے لئے ان کو اطلاع دیئے بغیر ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا تو آپ نے اپنے کلمات تشکر میں ایاز کا مشہور جملہ دوہرا کر اپنی گفتگو کا آغاز کیا جو تقریباً ضرب المثل ہے، ''ایاز قدر خود راشناس''، اس جملہ کے پس منظر میں ایاز کا وہ مکمل و منفرد واقعہ بھی نقل کیا جو بہت معروف ہے، حضرت مولانا کی یہ تواضع ان کی بلند پایہ شخصیت، حد درجہ استغناء و بے نیازی اور بے لوثی و اخلاص کی غماز ہے اور یہی سب چیزیں عظمتوں کا پتہ دیتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا کی شخصیت مختلف الجہات ہے، سب سے خاص جہت یہ ہے کہ وہ مفکر تھے، وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے تھے، تاریخ و سیرت اور قرآن و سنت پر گہری نظر رکھنے کے سبب پیش آنے والے حالات پر محکم تبصرہ کرتے تھے، اور صحیح اسلامی موقف اختیار کرتے تھے، مولانا کی بیشتر تصانیف ایک خاص فکری خاکے کے تحت ہی لکھی گئی ہیں، مولانا کی بیشتر جہتیں خاندانی مزاج اور موروثی ذوق کا حصہ ہیں، مولانا اگر داعی تھے تو یہ ان کے خاندانی مزاج کا حصہ تھا، تصنیفی و علمی ذوق ورثہ میں ملا تھا، خانقاہ کے ذریعہ اصلاح حال کی کوشش بھی خاندانی صفت تھی، مولانا کی پوری زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا میں تحریکی عنصر اس درجہ کا نہ تھا کہ خود کوئی تحریک چھیڑتے، مولانا نے حتی الامکان تحریکات کی صدارت و ذمہ داری قبول کرنے سے اپنے کو الگ رکھا، لیکن پھر بھی ملی تڑپ اور جذبۂ دعوت سے مغلوب ہو کر جابجا آپ کی حرکیت اور طبیعت کی انقلاب پسندی ظاہر ہو جاتی تھی، اور یہی وجہ ہے کہ جب آپ کے سامنے کسی تحریک و تنظیم کا خاکہ آتا تو پھر بتقاضۂ وقت اس تحریک کا ہر ممکن تعاون فرماتے اور گویا حالات کی تبدیلی کے ساتھ تحریکات اور بر وقت و مناسب اقدامات کے منتظر رہتے، سیاسی رہنمائی اور سیاسی تجزیات اور تحریکی و تنظیمی امور و مسائل میں جو بھی دلچسپی مولانا کو تھی وہ خاندان میں صرف ان کو سید احمد شہیدؒ کے واسطہ سے ملی تھی، اس حرکیت میں مولانا کے رفقاء کا بھی بڑا دخل تھا، مولانا کی تحریکی پیش رفت میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی رفاقت کا ذکر بار بار آتا ہے، دیگر رفقاء کار میں مولانا محمد الحسنی اور مولانا اسحق جلیس ندوی رحمہما اللہ رحمۃ واسعۃ قابل ذکر ہیں جو عملی خاکے تیار کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

مفکر اسلامؒ اسلام کو اقتدار میں دیکھنے کے خواہاں تھے، اس کے لیے بقدر استطاعت جو کچھ کر سکتے تھے وہ کیا، سیاسی سوجھ بوجھ پیدا کرنے کی کوشش کی، علماء کو حالات سے واقفیت اور بے لوث سیاسی خدمت و بصیرت کی ترغیب دی، کبھی امراء کو خطاب کیا کبھی بادشاہوں اور مملکت کے سربراہوں کو مخاطب کیا، خود ہندوستان کے مختلف وزرائے اعظم کو خطوط لکھے۔

مولانا کی نظر میں اسلام کو اقتدار تک پہنچانے کے دو راستے تھے ایک تو یہ کہ اسلام پسند لوگوں کو کرسی تک پہنچایا جائے اور دوسرا یہ کہ کرسی والوں تک اسلام پہنچایا جائے (یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ مولاناؒ نے اپنے یمن کے سفر ۱۹۴۸ء کی روداد لکھتے ہوئے شیخ یاسین عبد العزیز کی ایک گفتگو نقل کی ہے، مناسب معلوم ہوا کہ اس کو حاشیہ میں نقل کر دیا جائے: ''انھوں نے دین کی دعوت دینے والی اور اس کے غلبہ کی کوشش کرنے والی جماعتوں پر تبصرہ کیا اور کہا کہ دو طریق کار ہیں۔ ایک یہ کہ اہلِ ایمان (حکومت کی) کرسیوں تک خود پہنچ جائیں (یعنی ان کو براہِ راست اقتدار حاصل ہو جائے)۔ دوسرے یہ کہ ایمان ان کرسیوں تک پہنچ جائے (یعنی اہلِ حکومت دین کی دعوت قبول کر لیں اور اس کی ترویج و تنفید کا خود ذمہ لے لیں) انھوں نے فرمایا کہ میں آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے سمجھا ہوں کہ آپ اس دوسرے طریق کار ہی کو ترجیح دیتے ہیں، میں نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ ہمارے یہاں برصغیر ہند میں حضرت مجدد الف ثانیؒ، شیخ احمد فاروقیؒ (م ۱۰۳۴ھ) نے یہی طریق کار اختیار کیا تھا اور اس کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ ہمارے علم میں عالمِ اسلام میں کسی انقلابی واصلاحی تحریک کو حاصل نہیں ہوئی، پھر انھوں نے شمالی یمن کی موجودہ صورت حال، کام کے امکانات اور تقاضوں پر مختصر تبصرہ کیا اور اس کے بعد مجلس برخواست ہوئی اور ہم لوگ ان سے رخصت ہوئے، معلوم ہوا کہ ان کا نام شیخ یاسین عبد العزیز ہے''۔ [کاروانِ زندگی، ج ۳، ص ۳۳])، اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلا راستہ مشکل اور ٹکراؤ پیدا کرنے کا ہے اور دوسرا پر امن و پائیدار ہے، مولاناؒ نے پوری زندگی دوسرے موقف پر عمل کیا اور اپنی تمام تر کوششوں، اسفار، دوروں، خطابات، خطوط اور علمی وادبی صلاحیتوں کو اس کے لیے استعمال کیا، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب لینا صحیح نہیں کہ مولانا پہلے راستہ کے مخالف تھے یا اسکو غلط سمجھتے تھے، انھوں نے اپنی علمی و تصنیفی زندگی کا آغاز ہی ''سیرت سید احمد شہید'' سے کیا جن کی تحریکِ اصلاح و تجدید کی بنیاد ہی جہاد اور قیام حکومت ہے اور جو کتاب مکمل داستان انقلاب سے عبارت ہے، ابتدا میں ہی ان پر ایسے مضامین لکھے جو ان کی داستان عزیمت اور جذبۂ صادق کے ترجمان تھے، مفصل کتاب کو بھی اس کا یہی پہلو سید احمد شہید پر لکھی جانے والی دوسری کتابوں سے ممتاز کرتا ہے کہ اسمیں دعوت وعزیمت کے عنصر کو اجاگر کر کے پیش کیا گیا ہے، مولانا اس موقف کے مخالف کیوں کر ہو سکتے تھے جبکہ وہ موقف خود حضرت سید احمد شہیدؒ کا تھا، خود مولانا کے قلم سے نکلا کہ شہداء بالاکوٹ کا پیغام یہ ہے کہ ساری زندگی ایک ایسے قطعہ زمین کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس پر اللہ کا دین قائم کیا جا سکے، پاکستان میں ایک مرتبہ آپ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے اس لئے کہ امر و نہی استعلاء وغلبہ کے بغیر ممکن نہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں خود استعلاء کا مطالبہ کیا گیا ہے، مولانا نے ساری زندگی الاخوان المسلمون کی تائید کی اور اخوانی حلقہ نے بھی مولانا کی خوب پذیرائی کی بلکہ کہنا چاہیے اور اعتراف کرنا چاہیے کہ چوٹی

کے علماء اور بڑے بڑے ادباء جنہوں نے مولانا کو سر آنکھوں پر بیٹھایا، ان میں سے اکثر کا تعلق اخوان سے تھا، مولانا آخر تک اس سحر انگیز تحریکِ دعوت کے معترف و مداح رہے، بلکہ حسن البناء کے داماد و معتمد خاص ڈاکٹر سعید رمضان کو مولانا نے اپنے گھر کا سافرد قرار دیا اور ان سے گھر کے سے تعلق کا ذکر کیا، مولانا نے لکھا ہے کہ عربوں میں جیسا محبت واپنائیت کا تعلق میرا ڈاکٹر سعید رمضان سے ہوا ویسا کسی اور سے نہ ہوا، اپنی جگہ پر دونوں طریقے یقیناً مؤثر اور اہمیت کے حامل ہیں، ایک کی تایید دوسرے کی نفی نہیں ہو سکتی، اور مولانا کے یہاں تو طریقہ عمل کے ساتھ دوسرے موقف کے حاملین کی تائید بھی ہے، پھر ظاہر ہے کہ تاریخ اسلام میں دونوں موقف کی مثالیں ملتی ہیں، کبھی دعوت و تبلیغ اور افہام و تفہیم ہتھیار رہے، اور کبھی دعوت پیش کرنے کے بعد غلبۂ اسلام کے لئے طاغوتوں سے پنجہ آزمائی کرنی پڑی۔

یوں تو مفکر اسلامؒ کی پوری زندگی علم و عمل اور فکر و تدبر اور یقیں محکم، عمل پیہم و محبت فاتح عالم سے عبارت ہے، لیکن مولانا کی بصیرت اور اجتماعی و ملی تڑپ کو بطور مثال پیش کرنے کے لئے بلکہ قابل تقلید نمونہ کے طور پر ایک دو چیزوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، یوں تو مولاناؒ ہمیشہ پاکیزہ سیاست کی اہمیت کو سمجھتے تھے اور اس کو ایک رخ دینے کی کوشش کرتے تھے، اس کے لیے وہ عوام کے نمائندوں سے رابطہ کرتے تھے، امراء اور وزیروں سے مراسلت کرتے تھے، ممکن حد تک نقد و احتساب بھی کرتے تھے، افہام و تفہیم اور وضاحتوں کے ذریعہ راہ ہموار کرنے کی کوششیں کرتے تھے، فسادات کا بے لاگ تجزیہ کرتے تھے، مولانا نے پوری جرأت کے ساتھ ۱۹۹۰ء میں ایک مضمون میں یہ بھی لکھا کہ فسادات کے منجملہ اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ''ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں، اس کے مقابلہ میں صف آرا (Confront) ہو جانیوالوں، اور اس کو روکنے کے لئے ہر خطرہ مول لینے والوں کی کمی، خاص طور پر اس موقع پر مذہبی پیشواؤں کا میدان میں نہ آنا اور حالات سے مقابلہ نہ کرنا ہے''۔ مولانا ہمیشہ اپنے آپ کو محدود کر لینے کے خلاف رہے اور عملی اقدامات سے اس کا ثبوت دیا، مولاناؒ ''مسلم مجلس مشاورت'' کے قیام کی دعوت اور اس کی تاسیس میں نہ صرف پورے طور پر شریک رہے، بلکہ اسکے داعی اور سرپرست سمجھے گئے، اور اس کی سرپرستی کی، اس کی مجلسوں میں علالتوں کے باوجود شرکت کی اور اس کے دوروں میں شریک ہو کر انہیں مؤثر بنایا، مولانا کے جذبۂ دروں اور جذبۂ صادق اور ملی تڑپ، اجتماعی مفاد اور قومی تشخص کی حفاظت کے اشتیاق و تڑپ کی اس وقت انتہا نہ رہی جب ان کو اندیشہ ہوا کہ یہ مجلس بکھر جائے گی، اس دوران مولاناؒ سیتاپور میں تھے، آنکھ کا آپریشن ہوا تھا، ڈاکٹروں نے سفر تو دور زور سے بولنے کو بھی منع کیا تھا لیکن یہ اللہ کا بندہ جس کا مسلک تھا ؎

ایک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

کسی کے منع کرنے سے نہ مانے اور دہلی کا سفر اختیار کیا اور وہاں مجلس کی میٹنگ میں مؤثر تقریر کی اور اپنا دل نکال کر رکھ دیا، اس وقت تو یہ تقریر کامیاب رہی اور مجلس کسی بکھراؤ کا شکار نہ ہوئی لیکن ملت کے اس درد نے آنکھ کا ایسا درد دیا کہ وہ ضائع ہو کر رہی اور زندگی بھر اس درد کا احساس باقی رہا۔

حضرت مولانا کے سلسلہ میں یہ کہا جانا انتہائی غلط ہے کہ وہ کسی منکر کی تردید نہ کرتے تھے اور کسی تنظیم یا فرقہ پر تنقید نہ کرتے تھے، مولانا کی جرأت گفتار اور دینی غیرت و حمیت ہی ان کی تحریر و تقریر کا اصل جوہر ہے، مولانا نے بہت واضح تنقیدیں کی ہیں، عربوں کی بے راہ روی، عیش و عشرت پسندی، مادیت پرستی، حقیقی اسلام سے بُعد تقریباً آپ کے ہر عربی مضمون و خطاب کا حصہ رہا ہے، ہندوستان میں صحیح و غلط موقف کی وضاحت میں آپ نے اپنے قلم و زبان کو ہمیشہ استعمال کیا ہے، آپ کے رسالہ احادیث صریحۃ مع اخواننا العرب اور سلسلہ اِسمعیات آپ کی تنقیدوں اور صحیح تعبیر میں اصلاح کی غرض سے کی گئی تنقیدوں کا مجموعہ ہے، ملک و بیرون ملک کے کسی مسئلہ میں بھی مولانا مجاملت و مداہنت سے کام نہیں لیتے تھے، موقع پڑا تو اتحاد کی علامت سمجھے جانے والے اس داعی حق کو "دو متضاد تصویریں" لکھنے سے بھی کوئی امر مانع نہ رہا، وہ آوازۂ حق نہایت شان و صراحت سے بلند کیا کرتے تھے، مولانا کا رسالہ من الجاہلیۃ إلی الھدایۃ مولانا کی دینی غیرت اور منہج نقد و اصلاح کا غماز ہے، یہ رسالہ در حقیقت مولانا کے ان ہی جذبات کا عکاس ہے جن کا اظہار انہوں نے اپنے سفر حجاز ۱۹۵۰ء میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر عبد العلیؒ صاحب کے نام لکھے گئے خط میں کیا ہے، اس رسالہ میں مولانا نے جن امراض کی نشاندہی کی اور جن کوتاہیوں اور برائیوں کو اجاگر کیا وہ ختم نہ ہوئیں بلکہ دن بدن بڑھتی گئیں اور مولانا تھے کہ آخر تک منکر کی نکیر کرتے رہے، رابطہ عالم اسلامی کے جلسوں میں بسا اوقات حضرت مولانا اپنا دل نکال کر رکھ دیا کرتے تھے، اور زبان دل سے گفتگو کیا کرتے تھے، لیکن ان لوگوں پر کیا اثر ہوتا جنہوں نے ایک نیک انسان کے مخلص جذبات کے تحت ۱۹۶۲ء میں وجود آنے والی اس تنظیم کو محض اپنا ترجمان بنالیا اور ہمیشہ اس تنظیم کا استحصال کیا، حد یہ کہ جو شخص اس کا فکری مؤسس تھا اس کو چند سال کے بعد اس کی حق بیانی اور صاف گوئی کے سبب ایسا معتوب قرار دیا کہ آخری عمر یعنی ۱۹۹۵ء تک ان کا حجاز آنا جانا موقوف رہا، بہت کم لوگوں کے علم میں ہوگا کہ رابطہ عالم اسلامی کے فکری مؤسس شیخ حسن البناء کے داماد و معتمدِ خاص ڈاکٹر سعید رمضانؒ تھے اور ان ہی کی دعوت پر اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔

حضرت مولاناؒ حق گوئی میں ایک لحظہ بھی چوکتے نہ تھے، بلکہ بر وقت جواب دے دیا کرتے تھے، مولانا نے خود بیان کیا کہ ان کا رسالہ "ردۃ ولا أبا بکر لھا" بہت عام ہوا اور خوب پڑھا گیا، رابطہ عالم اسلامی کے جلسہ میں وہ تشریف رکھتے تھے کہ خمینی صاحب داخل ہوئے تو مفتی امین الحسینیؒ نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، پھر مولانا کو ان سے متعارف کرایا، تو خمینی صاحب گویا ہوئے، جی آپ کا رسالہ ردۃ ولا ابا بکر لھا پڑھا ہے لیکن اس کا نام ردۃ ولا ابا حسن لھا ہونا چاہیے تھا، خمینی صاحب نے اپنی روایتی عداوت اور عقیدے کی ترجمانی کر دی، لیکن مولانا کی ظرافت و حق گوئی نے ان کو یوں خاموش کیا کہ یہ تو ایسے ہی ٹھیک ہے، عربی محاورہ "قضیۃ ولا أبا حسن لھا" ہے۔

ڈاکٹر حسن الأمرانی نے اپنے ایک مقالہ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "شیخ ابوالحسن نے خود مجھ سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ خمینی صاحب میرے ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے اور دعا یوں پڑھتے تھے: ربنا اغفرلنا ولإخواننا الذین سبقونا بالإیمان، یہاں پہنچ کر رک جاتے اور آیت نہ پوری کرتے پھر اسی کو دوہراتے، تو میں ان سے قریب ہوا اور کہا: ولا

تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا، شیخ نے فرمایا کہ گویا میں نے ان کو کچو کہ لگایا"۔

یہاں اس کا ذکر ضروری ہے کہ یہ صرف میرا احساس نہیں کہ مولانا کی دعوت اور ان کے دینی جذبات سے جن لوگوں کو ہوش کے ناخن لینا چاہیے تھا انہوں نے نہ لیا، البتہ ایسا بھی نہیں کہ اس کا اثر نہ ہوا لیکن حکومتی سطح پر وہ نہ ہوا جس کی خود حضرت مولانا کو امید تھی، من الجبایہ الی الھدایۃ جو ابتداءً ایک خط تھا، اس کو مولانا نے مولانا عبید اللہ صاحب کے حوالے کیا، انہوں نے شیخ عمر بن الحسن کو پہنچا دیا کہ وہ مملکت سعودیہ کے ولی عہد کو پڑھ کر سنا دیں، مولانا یہ لکھنے کے بعد کہ معلوم ہوا کہ وہ انہوں نے سنا دیا یوں افسوس وحسرت کا اظہار کرتے ہیں:

"کاش! کہ اس خط کا کوئی عملی نتیجہ نکلتا، اور اسی وقت سے راستہ کی تبدیلی کی کوشش کی جاتی تو آج نہ صرف مملکت سعودیہ بلکہ عالم اسلام کی صورت حال بہت مختلف ہوتی"۔ (کاروان زندگی ج ا ص ۳۴۱)

مولانا کا ملی جذبہ اور دینی غیرت وحمیت "عرب قومیت" کے خلاف تحریک چلانے میں بھی قابل دید ولائق تقلید ہے، اس وقت مولانا پر اس فتنہ کی تنقید کا ایسا غلبہ تھا کہ جو لوگ مولانا اور ان کے خاندان کے مزاج سے واقف تھے وہ کہتے تھے ان کو کیا ہو گیا ہے، مولانا نے ایسی جرأت مندانہ تنقید کی کہ حکومت مصر کی شکایت پر حکومت ہند نے استفسار تک کیا، کہا جا سکتا ہے کہ عرب قومیت کے باطل نظریہ کے خلاف سب سے طاقتور آواز ہندوستان سے ہی بلند ہوئی، یہی نہیں بلکہ عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی ذلت آمیز شکست کا مولانا نے بے لاگ تجزیہ کیا ہے اور اس ضمن میں مولانا نے جزیرۃ العرب میں بیٹھ کر عربوں پر سخت تنقیدیں کی ہیں، اس سلسلہ کے مضامین کا مجموعہ "عالم عربی کا المیہ" حقائق کے انکشاف، حالات کا مومنانہ تجزیہ اور صاف گوئی کی جرأت پر دلالت کرتا ہے، مولانا نے اس وقت عربوں کی شکست کے جن اسباب کی نشاندہی کی وہ آج عربوں میں پہلے سے کئی سو فیصد زیادہ ترقی کر گئے ہیں، آپسی انتشار، مادیت پسندی، اقتدار کی حفاظت، اسلام سے دوری اور اسلام پسند لوگوں سے نفرت وعداوت نے انکو امریکہ کا غلام اور اسرائیل کا نمائندہ بنا دیا ہے، طبعی اور دینی واخلاقی دونوں نظامہائے زندگی سے ان کی بغاوت عروج پر پہنچ گئی ہے، اسرائیل سے جنگ کے موقع پر بقول مفکر اسلامؒ "ان پر بے چینی واضطرار طاری رہتا اور وہ اپنے اوپر اللہ کی مباح کردہ لذتیں بھی حرام کر لیتے" لیکن اب تو بات یہاں تک آپہنچی ہے کہ وہ ان ہی لذتوں کے لیے جیتے ہیں، بلکہ ان ہی اسباب تلذذ کی حفاظت کے لئے انہوں نے دین کو امریکہ واسرائیل کی پسند کے مطابق بقدر ضرورت استعمال کرنے اور اس کا پروپیگنڈہ کرنے تک محدود کر دیا ہے، اسلامی ممالک اغیار کے دست نگر بنا دیے گئے ہیں، دینی شعائر پر پابندیاں عائد کی جارہی ہیں! بے حیائی وفحاشی اور عریانیت ولذت کوشی نے ان کو اپنے شکنجہ ضلالت میں گرفتار کر کے دین کے نور بصیرت سے ہزاروں کوس دور کر دیا ہے، مدینہ طیبہ میں جوار مسجد نبوی میں مولانا کی یہ حق گوئی ملاحظہ کیجئے": صرف زمانۂ جنگ اور اس سے چند دن قبل کے اخبارات ورسائل پڑھئے کیا یہ اخلاق اور یہ طریقۂ زندگی اللہ اور اس کے رسول کی رضا کا موجب ہو سکتا ہے؟ کیا ام کلثوم کے گیت اللہ تعالی اور رسولؐ کی رضا اور فتح وکامرانی کے نزول کا ذریعہ بن سکتے ہیں؟ کیا یہ نائٹ کلب، عریانی وبے حیائی کے اڈے، جسے ہمارے بھائیوں نے اس ملک میں نئی زندگی بخشی جس پر مقدس اسلامی مقامات کے

دفاع کی سب سے بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ہمیں رسوائی وہزیمت سے بچا سکتے ہیں؟"۔(عالم عربی کاالمیہ ص ۷۸-۷۹)

مولاناؒ نے ایک طرف مغربی تہذیب پر تنقید کی تو دوسری طرف امت اسلامیہ کو اپنی تہذیب پر فخر کرنے کی دعوت دی، اسلامی تمدن کو اختیار کرنے پر ہر جگہ زور دیا، تعلیم، نظام تعلیم اور نصاب تعلیم پر اپنی قیمتی آراء پیش کیں، نظام تعلیم کو اسلامی بنانے اور نصاب میں دینی عنصر داخل کرنے کی تاکید کی، نصاب میں تجدید واصلاح کی رائے دی، مولانا در حقیقت مفکر تھے، وقت کے تقاضے پیش نظر رہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ عہد حاضر کے مفکرین میں مولانا منفرد ہیں، جن کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ علم میں دوئی کا کوئی تصور نہیں، یہ کہہ کر گویا انہوں نے ایک بہت بڑے انقلاب کی دعوت دی، ملی مسائل میں بڑھ کر حصہ لینے کے ساتھ علماء کو حالات سے جڑنے کی بھرپور و موثر دعوت دی، موقع پڑا تو شیعیت و قادیانیت کی تردید میں سارا زور صرف کر دیا، وسیع النظری اور وسعت فکری کا یہ مطلب سمجھنا مولانا کے نزدیک قطعی درست نہ تھا کہ حق کو حق اور باطل کو باطل نہ کہا جائے، وہ اس کو دعوت اتحاد کے منافی بھی نہ سمجھتے تھے بلکہ جب "دو متضاد تصویریں" کی تصنیف پر بعض اہل تعلق نے اعتراض کیا تو مولانا نے اس کو زندگی بھر کا سرمایہ اور باعث نجات قرار دیا اور اس کو علماء ربانیین ومجددین کا طریقہ قرار دیا، مولانا کی غیرت ایمانی انکی جرأت گفتار کو ہمیشہ رواں دواں رکھتی تھی، وہ باطل کی زیادتیوں پر مضطرب ہو جایا کرتے تھے اور یہ جذبات پھر زبان وقلم سے سیل رواں کی طرح جاری ہو جایا کرتے تھے اور عبارت کو جوش وغیرت سے معمور کر دیا کرتے تھے، دعوتِ اتحاد اپنی جگہ، جادۂ اعتدال کی پاسداری کا اپنا مقام لیکن مفکر وہی ہے جو موضوع اور وقت کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے مسائل کو پوری جرأت کے ساتھ بیان کرے، "سیرت سید احمد شہید" میں مولانا کا جو رنگ ہے وہ تادم آخر باقی رہا، اگر آج بھی حضرت والا بقید حیات ہوتے تو انکا قلم مجاہد کی تلوار کی طرح چلتا اور خون ناحق بہانے والوں پر انکی زبان دنیا بھر کو متوجہ کر دینے کے لیے کافی ہوتی، جو خون ناحق بہایا گیا اور جس طرح علماء کے ایک گروہ نے حق کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی اور مظلوم وامن پسند اور اسلام پسند مظاہرین کو بھیانک تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد مفسد ودہشت گرد قرار دیا گیا، اے کاش کہ یہ متحمس وغیرت مند اور مومن قلم زندہ ومتحرک ہوتا تو پوری دنیا میں اہل حق کے محاذ کی قیادت کا فریضہ انجام دیتا، نفوس قدسیہ کے دفاع اور مظلوموں کی حمایت کا یہ غیرت سے لبریز رنگ دیکھئے، سب جانتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک طبقہ مجاہد اسلام حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ کو کافر وگمراہ ثابت کرتا ہے، اس امر کا تذکرہ کرتے ہوئے مولاناؒ کے قلم سے جو جملے نکلے ہیں وہ ہمارے لیے دفاع حق کا نمونہ اور اعتدال وغیرت ایمانی سے مرکب ایک حسین تصویر ہیں، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا کی دوسری فضیلتیں تو رہیں بر طرف، انکی شہادت مسلم ہے اور شہداء کی مغفرت مسلم، لیکن ۲۴ ذو القعدہ ۱۲۴۸ء سے لیکر آج تک کم وبیش ۱۳۶ برس کے طویل عرصہ میں شاید ہی کوئی ایسا دن طلوع ہوا ہو، جس کی صبح کو اس شہید اسلام کی تکفیر وتضلیل کا کوئی فتویٰ نہ نکلا ہو، لعنت اور سب وشتم کا کوئی صیغہ استعمال نہ کیا گیا ہو، فقہ وفتاوی کی کوئی دلیل ایسی نہیں، جو اس کے کفر کے ثبوت میں پیش نہ کی گئی ہو، وہ ابوجہل وابولہب سے زیادہ دشمن اسلام، خوارج مرتدین

سے زیادہ مارق من الدین و خارج از اسلام، فرعون و ھامان سے زیادہ مستحق نار، کفر و ضلالت کا بانی، بے ادبوں اور گستاخوں کا پیشوا، شیخ نجدی کا مقلد و شاگرد بتایا گیا، یہ ان لوگوں نے کہا، جن کے جسم نازک میں آج تک اللہ کے لیے ایک پھانس بھی نہیں چبھی، جن کے پیروں میں اللہ کے راستے میں کبھی کوئی کانٹا نہیں گڑا، جن کو خون چھوڑ کر (کہ اس کا ان کے یہاں کیا ذکر؟) اسلام کی صحیح خدمت میں پسینے کا ایک قطرہ بہانے کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی! یہ ان لوگوں نے کہا، جن کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزت و عصمت بچانے کے لئے اس نے سر کٹایا، کیا اس کا یہی گناہ تھا، اور کیا دنیا میں احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر نظیر مل سکتی ہے؟ جس وقت پنجاب میں مسلمانوں کا دین و ایمان، جان و مال، عزت وآبرو محفوظ نہ تھی، سکھ اپنے گھروں مسلمان عورتیں ڈال لیتے تھے، مساجد کی بے حرمتی ہو رہی تھی، اور ان میں گھوڑے باندھے جاتے تھے، اس وقت یہ غیرت ایمانی وحمیت اسلامی کے مدعی کہاں تھے؟

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف　　　آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے"

(سیرت سید احمد شہید ج۲ ص۴۸۶-۴۸۷)

مولانا کی خدمات کا دائرہ بے حد وسیع ہے، باطل ادبی نظریات کے مقابلہ کیلئے اسلامی نظریہ ادب جو پہلے سے کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا اس کو ایک مستقل ادبی اسکول کی شکل دینے کا تجدیدی کارنامہ انجام دیا، ندوۃ العلماء کے سبزہ زار کو کئی مرتبہ عرب و عجم کے علماء اور عمائدین کے اجتماع سے معمور و منور کیا، امت اور بالخصوص اس کے مثقف طبقہ نیز امراء و حکام کی فکری رہنمائی کی کوشش کی، دینی تعلیم کی ضرورت واہمیت کی وضاحت کے ساتھ عصری تعلیم کو ایمان و اخلاقیات سے مربوط کرنے کی کوشش کی، عصری اور بالخصوص ملی دانش گاہوں کو ان کے فرائض وواجبات یاد دلائے، دینی تعلیمی تحریک کی صدارت کی، اصلاح نصاب کی آواز بلند کی، تعلیم کے وسائل کو سراہا، خود موئثر نصابی کتابیں تیار کیں، مدارس و یونیورسٹیز کو علیحدہ علیحدہ اپنی ذمہ داریاں یاد دلائیں، مولاناؒ کو اس کا سخت احساس تھا کہ جس طبقہ میں دین ہے وہ اقتدار سنبھالنے سے قاصر ہے اور جس طبقہ کے ہاتھ میں نظام حکومت اور کم از کم نظام تعلیم آتا ہے وہ دین سے دور ہے، اس کے سبب معاشرہ جس تضاد کا شکار ہوتا ہے اس سے کرب و بے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت اور ٹکراؤ کی حالت پیدا ہو جانا ناگزیر ہے، مولانا نے دیندار طبقہ کو مشورہ دیا اور خود انتھک محنت کی کہ اس طبقہ تک دین پہنچایا جائے اور اس کو اسلامی اخلاقیات سے متصف کیا جائے۔

مولانا کی ذات بے شمار خوشنما خوبیوں کا حسین مرقع تھی، ان کی خدمات نہایت وقیع اور سنجیدہ و بے لوث تھیں، ان کو اخلاص کی جو دولت نصیب ہوئی تھی اور روح کی جو پاکیزگی میسر تھی اس کے سبب لوگوں کو بے انتہا متأثر کرتے تھے، لوگ ان کے ہمنوا ہو جاتے تھے، کارآمد افراد کی ناز برداری کا ہنر مولانا جانتے تھے بلکہ مخالفین کو بھی ملت کے کام کا بنا لیتے تھے، رعایت و مروت مولانا کا خاص وصف تھا، لوگوں کو جوڑنے اور ان سے کام لینے کی حکمت معلوم تھی، آج بہت سے افراد کارآمد ہیں، لیکن افسوس کہ قحط الرجال کا شکوہ ہے، لیکن کارآمد لوگوں کو استعمال کرنے کا ہنر گویا معدوم ہو چکا ہے، اور

افراد سازی تو تقریباً مفقود ہے، بے کار لوگوں کو کارآمد بنانا تو دور! قریب آئے ہوئے لوگوں کو جوڑ کر رکھنے کا وصف بھی نظر نہیں آتا۔ لیکن حضرت مولاناؒ کی زندگی ان خوبیوں سے عبارت تھی اسی لیے انہیں جاں نثاروں اور لائق و فائق افراد کار کی ایک جماعت ہاتھ آگئی تھی، اس میں ان کی فراخ دلی، بے لوثی، ذاتی اور خاندانی مفادات سے آخری درجہ کی دوری، وسعت قلبی، دور اندیشی، متفکرانہ مزاج، دوسروں کے ساتھ حسن سلوک، طبیعت کی شرافت، دسروں کا اعتراف، بڑوں کے احترام کے ساتھ معاصرین کی عزت افزائی اور چھوٹوں کی دلجوئی کو بڑا دخل تھا، ظاہر ہے کہ ان تمام خصوصیات پر الگ الگ مقالات لکھے جا سکتے ہیں مگر یہاں سوانح لکھنا اور مولانا کی شخصیت و خدمات کا احاطہ کرنا مقصد نہیں ہے، مولانا کی پوری زندگی اس سے عبارت ہے کہ ؂

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اگر ان لوگوں کی روایات اور واقعات کو بہت احتیاط کے ساتھ جمع کیا جائے تو بھی الگ ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے جن کو حضرت مولانا نے ان کی صلاحیت و حیثیت کے اعتبار سے استعمال کیا، وہ بہت بڑے بڑے کام لوگوں سے لیا کرتے تھے اور ان کو آگے بڑھایا کرتے تھے، ان کی مدد کرتے اور انہیں ملت کے لئے استعمال کرتے، اس میں مولانا کی فردشناسی کے ساتھ ان کے انقلابی مزاج و حرکیت اور ملی تڑپ کو بڑا دخل تھا۔

بس چلتے چلتے یہ اور عرض کرنے کا دل چاہتا ہے کہ مولانا کو عند اللہ جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کا پرتو دنیا میں یوں نظر آیا کہ وہ خلق خدا میں بے پناہ مقبول ہوئے، انکو اہل دل کی دعائیں ملیں، اہل علم کی نظر میں قدر و منزلت حاصل ہوئی، ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ آپ کو وہ نفوس ملے جنہوں نے اپنی زندگیاں آپ پر نثار کردیں، مخلص و دور اندیش اور متحرک رفقاء کار کا ہاتھ آنا بھی بڑی نعمت ہے، مولانا کو ایسے مخلصین ملے کہ جو آپ کے علمی و فکری معاون ہونے کے ساتھ ساتھ ملی کاموں، ملک و بیرون ملک کے دعوتی دوروں اور اسفار کے اچھے مشیر و معاون رہے، کیا ہی خوب ہو کہ کوئی صاحب قلم اس پہلو پر بھی ایک دلآویز کتاب پیش کردے تاکہ اس دور آخر میں ایثار کرنے والے مخلصین کا بھی ایک پر کشش مجموعہ منظر عام پر آکر لوگوں کے لئے قابل تقلید ثابت ہو سکے، کہ اب تو ایثار و اخلاص عنقاء ہوئے جاتے ہیں اور ہر کس و ناکس مشیر و معاون بنا جاتا ہے، جس کے سبب عمل اور تحریک عمل کا متاثر ہونا یقینی ہے، مفاد پرستی جس قدر بڑھ گئی ہے افراد شناسی اسی قدر مفقود ہے۔

خدا کرے کہ صحیح معنیٰ میں سوزش و تڑپ اور اخلاص کی دولت ہاتھ آجائے، الفاظ کے خول معانی سے لبریز ہو جائیں اور اپنے مفادات ملت کے مفاد و اتحاد میں گم ہو جائیں، یہی پیغام ہے حیات و خدمات کا، فنائیت و اخلاص کے سبب ہی دلوں کو لوگ فتح کرتے تھے، وہی خصوصیت مولانا کو بھی حاصل ہوئی تھی، اسی اخلاص و بے لوثی کی ضرورت ہے تاکہ ملی اور دینی مفاد ہمیشہ ذاتی مفادات پر غالب رہے۔

☆☆☆

قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ء
(بہار میں اردو تعلیم و تعلم کا مستقبل)

محمد خالد ضیا صدیقی ندوی
(استاد: مدرسہ معینیہ عظمت العلوم، صاحب گنج، مظفرپور)

اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان ایک عطیۂ الٰہی اور خدا کی بیش قیمت نعمت ہے۔ زبان ہی کے ذریعے ہم اپنے مافی الضمیر کو ادا کرتے ہیں۔ یہ صرف دل کا ترجمان اور ترسیل افکار و خیالات کا ذریعہ نہیں ہوتی؛ بلکہ یہ افراد و اقوام کا شناخت نامہ بھی ہوا کرتی ہے۔ اس لیے یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ زندہ قومیں جہاں بہت سے ورثوں کی حفاظت کرتی ہیں، وہیں وہ اپنی زبان کے تحفظ و بقا کے حوالے سے بھی بڑی حساس اور فکر مند ہوا کرتی ہیں۔ دنیا میں بولی جانے والی بے شمار زبانوں میں اردو زبان اپنی بے شمار امتیازات و خصوصیات کی وجہ سے ایک منفرد مقام رکھتی ہے؛ یہ زبان گرچہ ملک کی کسی ریاست کی پہلی سرکاری زبان نہیں؛ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا جادو اندرون ملک ہی نہیں؛ بیرون ملک بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ داغ دہلوی کا یہ شعر دنیا کے انتہائی سچے شعروں میں شامل ہے کہ:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

مگر اس سچائی کا اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ اردو جیسی زندہ زبان کو فروغ دینے کے حوالے سے ہماری سرکار اور خود اردو داں طبقہ اُتنا سنجیدہ نہیں، جتنا ضروری ہے۔ اس کڑوی سچائی کی مثال یہ ہے کہ اردو تعلیم و تعلم کے مستقبل کے بارے میں غور و فکر کے لیے وقتاً فوقتاً محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ ذرا سوچیے کہ اگر اردو زبان کا مستقبل روشن نظر آرہا ہوتا، تو ہمیں اس عنوان کے تحت جمع ہونے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی؟ ہم اسی احساس کے تحت جمع ہونے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اردو زبان کے ساتھ ہو رہی زیادتی کے خلاف اگر وقت رہتے آواز نہیں اٹھائی گئی اور اس کے فروغ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے بارے میں فکر نہیں کی گئی تو ممکن ہے کہ اردو جیسی شیریں زبان بھی رفتہ رفتہ ماضی کی بہت سی زبانوں کی طرح دوسری زبانوں میں ضم ہو جائے، یا حاشیے پر چلی جائے اور اپنی شناخت کھو بیٹھے۔

اردو کی حفاظت ضروری کیوں؟

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ آخر اردو زبان کی حفاظت کے لیے اتنی فکر مندی کی ضرورت کیا ہے؟

تو یاد رکھنا چاہیے کہ اردو کی حفاظت کرنے اور اسے ترقی دینے کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ یہ ایک زبان کا مسئلہ ہے؛ بلکہ یہ ہمارا ملی فریضہ بھی ہے۔ آزادی کی لڑائی میں اردو کا بڑا حصہ رہا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ آزادی کی تحریک کو ولولہ انگیز بنانے میں ”سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا“ اور ”سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے“ جیسے لافانی نغموں

اور ’’انقلاب زندہ باد‘‘ جیسے نعروں نے مؤثر کردار ادا کیا ہے۔

اسی طرح اردو زبان ہماری تہذیب وثقافت کا بہترین مظہر بھی ہے۔ تہذیب کی بقا کے لیے بھی اس زبان کو باقی رکھنا ضروری ہے۔ اس پس منظر میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا یہ فقرہ بڑا معنی خیز معلوم ہوتا ہے کہ ’’اردو کی خدمت ہر مسلمان پر بہ قدر استطاعت واجب ہے‘‘۔ (۱)

اردو زبان کا تحفظ اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ ہمارے ہزاروں سال کے دینی لٹریچر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ بہ قول مولانا خالد سیف اللہ رحمانی: ’’ہمارے دینی علوم ومعارف کا بہت بڑا حصہ اردو زبان میں ہے۔ انگریزی یا دوسری مقامی زبانوں میں اسلام پر جو کچھ کام ہوا ہے، وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ ان حالات میں اگر ہماری نسلیں اردو زبان سے ناواقف رہیں، تو یہ براہ راست دین وایمان سے ان کا رشتہ کاٹ دینے کے مترادف ہوگا‘‘۔ (۲)

قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ء اور اردو دشمنی

یہ تہمت یا محض دعوی نہیں؛ بلکہ ایک سچی حقیقت ہے کہ اردو زبان کے حوالے سے ہماری مرکزی حکومت (اور کسی حد تک صوبائی حکومت بھی) بہت زیادہ سنجیدہ نہیں ہے۔ اور اس دعوے کی دلیل وہ پالیسی ہے جو قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ کے نام سے وضع کی گئی ہے۔ اس پالیسی کا دقت بینی سے مطالعہ کرنے والوں پر یہ امر مخفی نہیں ہے کہ اس میں اردو جیسی زندہ زبان کے ساتھ کیسا سوتیلا برتاؤ کیا گیا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ حکومت تعلیم کے نام پر پالیسی بناتی ہے، اور اس میں کئی ایسی زبانوں (جیسے: تمل؛ تلگو، کنڑ، ملیالم، اڑیا، پالی وغیرہ)(۳) کے کلاسیکی ادب کو فروغ دینے کی بات کرتی ہے جو ایک طرح کی علاقائی اور جغرافیائی حدبندی والی زبان ہے، جو خاص خاص علاقوں میں ہی بولی جاتی ہے؛ حد تو یہ ہے کہ بعض ایسی زبانوں (جیسے: پراکرت اور سنسکرت)(۴) کے فروغ کی بات بھی کرتی ہے جو تقریباً مردہ یا متروک ہو چکی ہیں؛ لیکن اردو جیسی زندہ زبان کا ذکر تک نہیں کرتی جو جغرافیائی بندش اور علاقائی حدبندی سے آزاد ہو کر پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور نہ صرف بولی اور سمجھی جاتی ہے؛ بلکہ اس کے اثرات اس ملک کی تمام زبانوں پر پائے جاتے ہیں اور پوری دنیا میں جس کی کشش محسوس کی جاتی ہے۔ ہم اسے لسانی عصبیت کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں؟

یقیناً اس پالیسی میں بہت سی مثبت باتیں اور تعلیمی ڈھانچے کو خوب سے خوب تر بنانے کے سلسلے میں عمدہ تجاویز بھی ہیں؛ مگر اس کے ساتھ ساتھ کچھ اندیشے اور وساوس بھی ہیں جو اس پالیسی کے مطالعے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اس پالیسی میں زبان کے حوالے سے سہ لسانی فارمولے کی بات بار بار دہرائی گئی ہے۔ جس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ’’اس سہ لسانی فارمولے کے انتخاب کے سلسلے میں ریاست کو آزادی حاصل ہوگی، کسی بھی ریاست پر کوئی زبان تھوپی نہیں جائے گی۔ تین زبانوں کا انتخاب ریاست، خطے اور طلبہ کی اپنی مرضی پر ہوگا اس شرط کے ساتھ کہ تین میں سے کم از کم دو زبانیں بھارتی ہوں‘‘۔ (۵) اس پیراگراف سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

۱- اس پالیسی کی تنفیذ کے سلسلے میں ریاستی حکومتوں کا اہم کردار ہوگا۔

۲- سہ لسانی فارمولے میں دو زبانوں کا ہندوستانی ہونا ضروری ہوگا۔

اب ذرا سوچیے وہ دو زبانیں کون سی ہو سکتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ وہ ہندی اور انگریزی کے سوا اور کون ہو سکتی ہیں۔ ہندی سے چارہ اس لیے نہیں کہ یہ ہندوستان کی سرکاری زبان ہے۔ اور انگریزی سے مفر اس لیے نہیں کہ یہ پوری دنیا کے لیے کم و بیش رابطے کی زبان کے طور پر اپنی اہمیت تسلیم کرا چکی ہے، ساتھ ہی گلوبلائزیشن (انگریزی عالم کاری) کے اس دور میں روزگار کے بہتر مواقع اس زبان کو سیکھے بغیر نہیں مل سکتے۔ اب جو ایک زبان بچے گی جس کے انتخاب میں علاقے کے طلبہ کی پسند کا خیال رکھا جائے گا، وہ زبان علاقائی اور مقامی ہی ہو سکتی ہے۔ بنگال کا رہنے والا طالب علم ظاہر ہے کہ کنڑ کا تو انتخاب نہیں کرے گا، وہ تو اپنے صوبے کی سرکاری زبان ہی کو ترجیح دے گا۔ اس لحاظ سے تو یہ خوش آئند بات ہے کہ اس سے علاقائی اور مقامی زبانوں کا فروغ ممکن ہے؛ لیکن اردو کا مسئلہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ملک کی دوسری زبانوں سے بہت مختلف ہے؛ کیوں کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس کے بولنے والے پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، ایسی حالت میں اردو کے سلسلے میں مرکزی حکومت کی جانب سے کسی مخصوص پالیسی کی ضرورت تھی؛ لیکن خصوصی پالیسی تو کجا، قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ کے دستاویز میں اردو کا کہیں ذکر تک نہیں ہے[۶]۔ اردو دشمنی کی اس سے زیادہ واضح مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

امید کی ایک موہوم سی کرن

البتہ اس پالیسی میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ دستور ہند کے آٹھویں شیڈول (Eighth Schedule) میں جو زبانیں شامل ہیں ان کا فروغ بھی کیا جائے گا[۷]۔ اس سے امید کی ہلکی سی کرن نظر آتی ہے؛ کیوں کہ دستور ہند کے آٹھویں شیڈول (Eighth Schedule) میں ۲۲/ زبانوں کو شامل کیا گیا ہے، جن میں اردو بھی شامل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جناب محمد محب الحق صاحب (پروفیسر شعبہ سیاسیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کا یہ خیال بھی صد فی صد درست ہے کہ "دستور کے آٹھویں شیڈول میں شامل تقریباً تمام زبانوں کی جغرافیائی حدود ہیں، یا ان کے بولنے والے کچھ خاص خطوں میں موجود ہیں؛ لیکن اردو ایک قومی زبان کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے بولنے والے ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ جب لسانی بنیادوں پر ریاستوں/صوبوں کی تشکیل کی گئی تو اردو کی بنیاد پر کوئی صوبہ/ریاست قائم نہیں کی گئی۔ لہٰذا آج کسی بھی ریاست کی پہلی سرکاری زبان اردو نہیں ہے۔ ایسی حالت میں قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ کے تحت سہ لسانی فارمولا اردو کو نظر انداز کرتا محسوس ہوتا ہے"۔[۸]

قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ء میں اردو زبان کو کس طرح نظر انداز کیا گیا ہے اس کی ادنی سی جھلک اوپر کی سطروں میں پیش کی گئی۔ اب یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس پالیسی کے تحت بہار میں اردو کی تعلیم و تعلم کا مستقبل کیسا نظر آتا ہے۔

بہار میں اردو تعلیم و تعلم کے مسائل

اس حوالے سے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ریاست بہار دوسری ریاستوں کے مقابلے میں شروع سے اردو کی قدرداں، اور اس کے فروغ اور نشر و اشاعت کے حوالے سے فراخ دل اور کوشاں رہی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے بہت

سے مستحسن اقدامات بھی کیے ہیں؛ لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ بہار میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے کے باوجود اب تک اس کی تنفیذ کی سمت کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا؛ بلکہ وقتاً فوقتاً اس کے فروغ کی راہ میں رکاوٹیں ہی کھڑی کی جاتی رہیں۔اب ذرا سوچیے کہ نئی قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ میں تو پہلے ہی سے اردو نظر انداز ہے،اب اگر بہار جیسی ریاست میں (جہاں اردو کو یک گونہ سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے) بھی اس کو وہ مقام نہ ملے جس کا وہ مستحق ہے، تو پھر کیا اردو کی تعلیم و تعلم کا سنہرا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے؟

اردو تعلیم و تعلم کے حوالے سے یہاں کی صورت حال کافی پیچیدہ ہے۔اسکول کے درو دیوار اور اس کی چہار دیواری کے اندر اردو کے ساتھ جس طرح کا سوتیلا برتاؤ کیا جاتا ہے، اس سے اردو برادری واقف ہے۔

اس بات کا رونا بہت رویا گیا ہے کہ اردو کے لیے اساتذہ کی بحالی کی جائے، اب اردو کے لیے اساتذہ کی بحالی کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے؛ لیکن اس کے باوجود بھی منتظمین کی طرف سے کہیں نہ کہیں یہ رکاوٹ سامنے آئی ہے کہ انھیں اردو پڑھانے نہیں دیا جا رہا ہے، یا پھر دیگر موضوعات کو جس طرح مقام ملا ہوا ہے وہ مقام اردو کو نہیں دیا گیا ہے۔ حتی کہ سالانہ یا ششماہی امتحان کے موقع پر اردو میں پرچے دستیاب نہیں ہوتے ہیں۔اردو کی کلاسز باضابطہ طور پر نہیں لی جاتی ہیں۔جو اساتذہ اردو کے لیے متعین کیے گئے ہیں، ان کو دیگر موضوعات پڑھانے کے لیے دے دیے جاتے ہیں۔ایک جنرل ٹیچر کے طور پر ان کو دیکھا جاتا ہے جب کہ ان کا تقرر صرف اور صرف ایک سبجیکٹ کے لیے ہوا ہے۔اس سے زیادہ افسوس کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسکولوں میں اردو کے اساتذہ ہونے کے باوجود اردو کو جو واجبی مقام ملنا چاہیے، اردو اب تک اس سے محروم ہے۔

جب بلاک لیول پر یا ضلعی سطح پر اردو کے پڑھنے والے طلبہ کی تعداد معلوم کی جاتی ہے تو منتظمین اس سلسلے میں بہت زیادہ لاأبالی پن کا مظاہرہ کرتے ہیں اور منتظمین کی طرف سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ اردو کے طلبہ کا ریکارڈ بھی اپنے اعلی ذمے داروں تک نہیں پہنچاتے ہیں۔یہ ایک کڑوی سچائی ہے جسے تسلیم کرنا چاہیے۔

یہ ہے بہار میں اردو تعلیم وتدریس کی راہ میں رکاوٹوں کی ہلکی سی جھلک؛ مگر یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔تصویر کا دوسرا رخ بھی کم عبرت ناک نہیں۔اور وہ یہ کہ اردو پڑھنے اور سیکھنے والے طلبہ کا گراف تشویش ناک حد تک روز بروز گھٹتا جا رہا ہے۔طلبہ کو اردو تعلم کا وہ شوق نہیں جو دیگر مضامین کے پڑھنے اور سیکھنے میں نظر آتا ہے۔طلبہ کی اردو سے بے رغبتی کا حال اردو کے ایک بے غرض خادم مشتاق احمد نوری صاحب کی زبان قلم سے سنیے۔وہ لکھتے ہیں:

”آج عالم یہ ہے کہ سرکاری اسکولوں میں اردو ٹیچر بحال کیے جا رہے ہیں؛ لیکن انھیں شکایت ہے کہ بیشتر اسکولوں میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔کچھ اسکولوں میں جب اردو خواں طلبہ وطالبات نہیں ملتے ہیں، تو مجبور ہو کر ایسے اردو ٹیچر اپنے اسکولوں میں دوسرے مضامین پڑھانے پر مجبور ہوتے ہیں“[۹]۔

بہار کے اردو مسائل کے تذکرے کے ذیل میں شاید اس جگہ بے موقع نہ ہوگا اگر ان اداروں کے بارے میں

بھی اشارہ کر دیا جائے جو ادھر کئی برسوں سے شدید تعطل کا شکار ہیں اور جو اردو زبان وادب کی خدمت کے حوالے سے اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ جیسے: بہار اردو اکادمی، بہار اردو مشاورتی کمیٹی وغیرہ۔ اسی طرح بہت سے اقلیتی اداروں کی سرگرمیاں بھی ٹھپ پڑی ہوئی ہیں۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ جیسا قدیم اور بافیض ادارہ اپنی زبوں حالی اور بے رونقی پر ماتم کر رہا ہے۔ اردو زبان اور اقلیتی اداروں کے سلسلے میں حکومت کی اس عدم دل چسپی اور سرد مہری کی وجہ سے بہار کی اردو آبادی اردو کے حوالے سے تشویش میں مبتلا ہے۔

اردو کے مذکورہ مسائل کا حل اور صرف ایک حل

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ اساتذہ اردو کے تئیں اپنی ذمے داریاں ادا کرنا چاہتے ہیں، اور دلچسپی لینے والے طلبہ تک اپنے تجربات پہنچانا چاہتے ہیں؛ لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ جن اسکولوں میں منتظمین اردو سے نابلد ہیں، وہ اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ اردو پڑھنے والے طلبہ کا ریکارڈ آگے تک نہ پہنچ سکے۔ اس لیے اردو تعلیم وتعلم کے حوالے سے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسکولوں میں اس کی صحیح طور پر تنفیذ ہو جائے۔ اور تنفیذ کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو دور کرنے کی مضبوط اور منصوبہ بند کوشش کی جائے۔ یا کوئی ایسا لائحۂ عمل اساتذہ کو دیا جائے کہ اگر منتظمین کی طرف سے کوئی رکاوٹ سامنے آئے تو اس لائحۂ عمل کی روشنی میں وہ اپنی بات آگے تک پہنچا سکیں اور جو بالائی اتھارٹی اور اعلی ذمے داران ہیں، وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ اردو پڑھنے اور پڑھانے کا سلسلہ جاری رہے۔

قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ میں زبان کے حوالے سے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ابتدائی طلبہ کو ان کی مادری/علاقائی/مقامی زبان میں تعلیم دی جائے گی؛ یہ ایک خوش آئند اور قابل ستایش بات ہے، جس کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے۔ کیوں کہ مادری زبان میں تعلیم دینا اور تعلیم اخذ کرنا ایک فطری اور آسان طریقہ ہے۔ تو اگر ہمارے وہ اسکول جہاں مسلم طلبہ یا اردو داں طبقے کے بچے پڑھتے ہیں وہاں کے اساتذہ اور وہاں کے منتظمین اس بات کو لازم پکڑ لیں کہ وہ اردو کو پڑھائیں گے اور اردو پر دیگر تمام سبجیکٹس اور موضوعات کی طرح توجہ دیں گے تو معاملہ آسان ہو جائے گا اور اردو کی تعلیم وتعلم کا مستقبل روشن ہو سکے گا۔

ہماری ذمے داری

یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کوئی بھی زبان اسی وقت ترقی کرتی ہے جب اس کو اہمیت دی جاتی ہے، اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اردو کی حفاظت کی ذمے داری صرف حکومت کی نہیں ہے؛ بلکہ اس سے زیادہ ذمے داری اس کے بولنے والے پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اگر میری تلخ نوائی گوارا کر لی جائے تو میں یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ اردو کو اس زبوں حالت تک پہنچانے میں ہماری بے حسی اور بے توجہی کا بھی بڑا دخل ہے۔ آج ہم اردو بولنے کا دعویٰ کرنے والے بھی اس کی اہمیت اور افادیت کو فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ اردو سے ہم نے اپنا اور اپنی نئی نسل کا رشتہ مکمل کاٹ کر رکھ دیا ہے، پھر ایسے میں دوسروں سے شکوہ وگلہ کیسا؟! اگر اردو کے بولنے والے یہ عزم کر لیں

کہ اس زبان کو ہر حال میں وہ باقی رکھیں گے، اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم اردو زبان میں دینے کا اہتمام کریں گے، اپنی تحریر و تقریر، تدریس و صحافت کا ذریعہ اسی زبان کو بنائیں گے۔ اردو رسائل وکتب، اور اخبارات و جرائد کی نشر و اشاعت میں وہ حصہ لیں گے، اپنے دکانوں کے بینر، آفسوں اور مختلف شعبہ جات کے ناموں کی تختی (Name plate) پر اس کو جگہ دیں گے، شادی بیاہ کے کارڈ میں اس زبان کو زندہ رکھیں گے، تو پھر اس زبان کے فروغ کا راستہ روشن نظر آئے گا۔

یاد رکھیے! وہی راستے پامال ہو جاتے ہیں جن پر لوگ چلنا چھوڑ دیتے ہیں، اس لیے اگر اردو کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ان کی زندگی کا سامان ہمیں خود فراہم کرنا ہوگا اور اس کے لیے جو تحریکیں، تنظیمیں یا افراد کوشاں ہیں ان کے کندھوں کو مضبوط کرنا ہوگا۔

خلاصہ

۱- نئی قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ کے غائرانہ مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ایک نظریاتی پالیسی ہے، جس کے اثرات ونتائج بڑے گہرے؛ بلکہ خطرناک ہو سکتے ہیں۔ یہ پالیسی ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں جمہوریت کو کچلنے کے مترادف ہے۔ اس لیے اس نئے تعلیمی نظام پر کیے جانے والے تبصروں میں اے آئی ڈی ایم کے کے صدر ایم کے اسٹالن کا یہ تبصرہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ یہ "پرانے جابرانہ منوسمرتی نظام پر ایک خوش نما لبادہ ہے"[۱۰]۔

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

۲- اس پالیسی کی گفتگو کی زبان چوں کہ بہ ظاہر مثبت اور حوصلہ بخش ہے، اس لیے اگر عبارت کے کسی گوشے یا الفاظ کے کسی شوشے سے کوئی امید کی روشنی نظر آئے تو بہت زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے؛ کیوں کہ:

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

۳- اس پالیسی کے بہت سے مندرجات اطمینان بخش ہیں؛ لیکن جن زبانوں کے فروغ کی بات کہی گئی ہے ان میں اردو جیسی زندہ، فیض رساں اور ہمہ گیر زبان کو شامل نہ کرنا، بہر حال ایک تشویش ناک پہلو ہے، جس سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

۴- جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ قومی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ میں اردو کا تذکرہ نہیں۔ اگر مادری زبان میں اردو کو بھی شامل کر لیا جائے تو بھی غور کے لائق بات یہ ہے کہ اس کو صرف ایک اضافی اور اختیاری مضمون کی حیثیت دی گئی

ہے۔اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حکومت کوئی بھی ہو، وہ اردو کو وہی درجہ دینا چاہتی ہے، جو درجہ ان کی نظروں میں مسلمانوں کا ہے۔اس لیے بہار کی حکومت اگر اردو نوازی کا دعوی کرنے میں سنجیدہ ہے، تو اس کو چاہیے کہ اسکولوں میں اردو کی لازمیت اور اس کی تعلیم وتدریس کو یقینی بنائے۔

۵- حکومت اردو زبان کے ساتھ تعصب اس لیے بھی برتتی ہے کہ اس کا تعلق عام طور سے مذہب اور ایک مذہب کے ماننے والے سے جوڑ دیا گیا ہے، اس لیے سرکار یہ سمجھتی ہے کہ اس زبان کے پڑھنے والے صرف اور صرف مسلمان ہوں گے۔ مگر اس کے باوجود جن خطوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے، سرکاری پالیسی کے مطابق وہاں اردو اسکولز قائم کیے جاتے ہیں، اور اساتذہ بھی اردو پڑھانے کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ایسے علاقوں میں بہت سارے اردو اسکولز مسلمانوں یا اردو بولنے والوں کی لاپروائی یا انتظامیہ کی بدنیتی کی وجہ سے اب ہندی اسکول میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ ایسے میں انتظامیہ سے زیادہ اردو داں طبقے کو متحرک ہو کر اپنے فرائض ادا کرنے کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ حقوق تبھی ملتے ہیں جب فرائض ڈھنگ سے ادا کیے جاتے ہیں۔اس لیے ان علاقوں اور جگہوں کی نشان دہی کر کے جہاں اردو اسکولز قائم ہیں یہ آواز پوری وقت کے ساتھ اٹھانی چاہیے کہ وہاں اردو کو ایک اختیاری مضمون کے طور پر نہیں، لازمی سبجیکٹ کے طور پر پڑھایا جائے۔

حوالہ جات

۱- بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان اور درپیش مسائل، صفحہ: ۸-۹، مرتب: ڈاکٹر سید احمد قادری، انجمن ترقی اردو، بہار، ضلع گیا، سنہ اشاعت: ۲۰۰۵

۲- روزنامہ منصف، حیدر آباد، کالم: شمع فروزاں، بہ عنوان" اردو زبان میں تعلیم"، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، تاریخ اشاعت: ۱۱/نومبر ۲۰۲۲ء

۳- تفصیل کے لیے دیکھیے: قومی پالیسی برائے تعلیم ۲۰۲۰ء، صفحہ: ۲۲، پیرا گراف: ۴.۱۸، شائع شدہ: وزارت تعلیم، حکومت ہند

۴- حوالۂ سابق

۵- حوالۂ سابق صفحہ: ۲۱، پیرا گراف: ۴.۱۳

۶- مستفاد: دعوت نیوز ڈاٹ نیٹ، تاریخ اشاعت: ۷ار دسمبر ۲۰۲۰ء، بہ عنوان: "نئی قومی تعلیمی پالیسی اور اردو کا المیہ"، از، محمد محب الحق

۷- دیکھیے: قومی پالیسی برائے تعلیم -۲۰۲۰ء، صفحہ: ۲۰، پیرا گراف: ۴.۱۲

۸- دعوت نیوز ڈاٹ نیٹ، تاریخ اشاعت: ۷ار دسمبر ۲۰۲۰ء، بہ عنوان: "نئی قومی تعلیمی پالیسی اور اردو کا المیہ"، از، محمد محب الحق

۹- بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان اور درپیش مسائل، صفحہ: ۲۱، مرتب: ڈاکٹر سید احمد قادری، انجمن ترقی اردو، بہار، ضلع گیا، سنہ اشاعت: ۲۰۰۵ء

۱۰- دیکھیے: قندیل ڈاٹ کام، بہ عنوان: نئی تعلیمی پالیسی—ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ، از: شمیم اکرم رحمانی

☆☆☆

حسّاسیت-اہم ایمانی صفت

محمود محمد الخزندار/ترجمانی: عمر محمد غزالی

کوئی شخص اسی وقت زندہ دل اور بابصیرت ہو سکتا ہے جب اس کی شخصیت میں حسّاسیت کا عنصر نمایاں ہو، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر انسان اپنے گردوپیش کے حالات میں کوئی مضبوط موقف اختیار کرتا ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جس کی وجہ سے انسان پر امت کے مسائل اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ دین وملت کے لیے متحرک ہوتا ہے۔

جو شخص حساسیت سے محروم ہو وہ بے شعوری، بے بصیرتی، مردہ دلی اور جمود کی ایک مثال بن جاتا ہے۔ ایسے لوگ ہر معاملہ پر تو نہایت سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہیں؛ لیکن جیسے ہی ان کے ذاتی مفادات کا مسئلہ آتا ہے تو فوراً ان کے جذبات میں اُبال آجاتا ہے اور اپنی ساری توانائی صرف کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک ان کا ذاتی مسئلہ امت کے تمام مسائل سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

حساسیت کی علامات اور تقاضے

(۱) دوسروں کے جذبات کی رعایت:

حساسیت رکھنے والے شخص کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر ایک کے احساسات اور نفسیات کی رعایت کرتا ہے۔ وہ اس بات سے حتی الامکان گریز کرتا ہے کہ کسی کے جذبات کو ادنی سی ٹھیس پہنچے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کی تربیت کے دوران میں انہیں اس چیز کی بطور خاص تعلیم دی ہے۔ صحیح مسلم میں ایک واقعہ مروی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ (جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) کا گزر حضرت سلمان فارسی، حضرت صہیب اور حضرت بلال کے پاس سے ہوا، ان حضرات نے دینی حمیت سے مغلوب ہو کر ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے سامنے کہا: "بخدا اب تک اللہ کی تلواروں نے اللہ کے دشمن کی گردن سے اپنا حق وصول نہیں کیا ہے۔" حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو یہ سخت کلامی پسند نہ آئی؛ چنانچہ انہوں نے ان حضرات سے کہا: "کیا آپ حضرات ایسی بات قریش کے سردار شخص کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟"، اس واقعہ کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور انہیں سب کچھ بتلایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس موقع پر سب سے پہلے جس بات کی فکر دامن گیر ہوئی وہ یہ تھی کہ کہیں ان حضرات کو حضرت صدیق اکبرؓ سے کوئی دلی تکلیف تو نہیں پہنچی ہے؟ چنانچہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے ابو بکر! کہیں وہ لوگ تم سے آزردہ خاطر اور افسردہ نہ ہو گئے ہوں، اگر ایسا ہوا ہو گا تو اللہ بھی تم سے ناراض ہو جائے گا"، یہ سن کر حضرت صدیق فوراً ان حضرات کے پاس آئے اور کہا: اے میرے بھائیوں! کیا میں نے تمہیں ناراض کر دیا ہے؟ ان حضرات نے کہا: نہیں نہیں، اللہ آپ کی مغفرت فرمائے ہمارے بھائی! (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ: حدیث: ۱۷۰)

(۲) دوسروں کی تکلیفوں پر کڑھنا اور غم بانٹنا:

زندہ دلی اور حساسیت کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ آپ کا مؤمن بھائی غم زدہ اور پریشان ہو تو آپ بھی بے چین اور فکر مند ہو جائیں اور غم ساجھا کرنے کی کوشش کریں۔ احادیث میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں، مثلاً جب غزوۂ بدر کے بعد قیدیوں سے فدیہ لے کر رہائی کرنے پر اللہ نے خفگی کا اظہار کیا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر گریہ طاری ہو گیا، اللہ کے رسول کو دیکھ کر حضرت ابو بکر بھی اشکبار ہو گئے، ان دونوں کو اس حال میں دیکھ کر حضرت عمرؓ فرمانے لگے: ''اے رسولِ خدا! ذرا بتائیں کہ آپ دونوں کس وجہ سے رو رہے ہیں؟ اگر میرے لیے رونے کی کوئی وجہ رہی تو میں بھی رونے میں شریک ہو جاؤں گا اور اگر کوئی وجہ نہیں رہی تب بھی آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے بتکلف رونے کی کوشش کروں گا۔'' (صحیح مسلم، باب الامداد بالملائکۃ) صحیح بخاری میں ایک دوسرا واقعہ مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، ان پر حالتِ نزع طاری تھی، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تکلیف کو دیکھ کر رونے لگے۔ (البخاری، کتاب الجنائز: حدیث: ۱۳۰۴)۔ اسی طرح جب اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی والدہ رضی اللہ عنہا کی قبر پر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی تو وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سیل اشک رواں ہو گیا، یہ دیکھ کر صحابہ بھی رونے لگے۔ (صحیح مسلم، کتاب الجنائز: ۱۰۸)۔

دور نبوت کا مسلم معاشرہ اس حساسیت کا کس قدر حامل تھا اس کا اندازہ صحیح بخاری میں مروی ایک واقعہ سے کیجئے کہ جب ایک انصاری خاتون کو یہ پتہ چلا کہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ سلام اللہ علیہا (واقعہ افک کے) الزام سے بیحد غمگیں ہیں تو وہ باقاعدہ غم بانٹنے کے لیے آپ کے پاس آئیں، اور ساتھ بیٹھ کر رونے میں شریک ہو گئیں۔ (صحیح البخاری: کتاب الشھادات، باب ۱۵)

حساسیت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی مومن کرب وابتلا سے گزر رہا ہو تو آپ کی آنکھوں سے نیند اڑ جائے، اگر اپنے بھائیوں کے مصائب کے تذکرہ پر بھی آپ کے جذبات میں طغیانی پیدا نہ ہو اور آپ کی آنکھیں خشک رہ جائیں تو آپ کے دل کے مردہ ہونے کوئی شک نہیں ہے، اسے زندہ کرنے کی فکر کیجیے!

(۳) اپنے گناہوں پر تأسف اور ندامت:

حسّاسیت کی ایک نمایاں ترین علامت یہ ہے کہ انسان اپنی سیئات پر پشیماں ونادم ہو اور توبہ کی فکر کرے۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ سیدہ عائشہ سلام اللہ علیہا نے یہ نذر مان لی کہ وہ اپنے بھانجے حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے کبھی بات نہیں کریں گی، پھر ان دونوں کے درمیان مصالحت ہو گئی، اس کے بعد سیدہ عائشہ کو جب بھی یہ واقعہ یاد آتا تو (ایک غیر مناسب کام کی نذر کرنے پر بہت پشیمان ہوتیں اور) اتنا روتیں کہ ان کی اوڑھنی تر ہو جاتی تھی۔ (صحیح البخاری، کتاب الأدب: حدیث: ۶۰۷۳)

خیر القرون کے بعد اس حساسیت میں تدریجاً کمی آتی چلی گئی یہاں تک کہ اب یہ حال ہو چکا ہے کہ مہلک ترین

گناہوں کا ارتکاب بھی بہت معمولی چیز بن گئی ہے۔ گناہوں کی شناعت کا احساس ختم ہو چکا ہے۔ حالانکہ زندہ دلی اور ایمان کے لیے یہ شرط ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس کو نیکی کرنے کے بعد خوشی حاصل ہو اور گناہ کرنے کے بعد غم ہو تو ایسا شخص ہی حقیقی مؤمن ہے''۔(سنن الترمذی، أبواب الفتن: حدیث: ۲۱۵۸ و ۲۲۶۸)۔

ندامت اور خوف جیسی صفات کے حامل افراد روزِ محشر اللہ کے عذاب سے بطور خاص مامون رہیں گے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''ایک شخص گناہ کا ارتکاب کر لیتا ہے پھر وہ اس کی وجہ سے خوف میں مبتلا رہتا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اسے عذاب سے بالکل محفوظ رکھا جائے گا''۔(فتح الباری)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نصیحت بھی کتب حدیث میں وارد ہے کہ ''اپنے گناہوں پر روتے رہا کرو''۔(الترمذی، أبواب الزھد، حدیث: ۱۹۶۱ و ۲۵۳۰)

(۴) شفقت اور رحمدلی:

کچھ مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں ہر زندہ دل انسان کو رحم آجاتا ہے اور انسان کی حساسیت وہاں شفقت کا تقاضا کرتی ہے۔ مثلاً حضرت ابو ایوب انصاری نے ایک ایسی قیدی عورت کو روتے ہوئے دیکھا جسے اس کے بچہ سے جدا کر دیا گیا تھا، چنانچہ انہوں نے اس کا بچہ اسے لا کر دے دیا، جب اس مہم کے امیر نے اعتراض کیا تو حضرت ابو ایوب نے ماں اور بیٹے کو جدا کرنے پر نبی علیہ السلام کی وعید سنائی، یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ زیادتی کے خلاف بھی کس قدر حسّاسیت کی تعلیم دیتا ہے۔

(۵) ظلم اور ظالموں سے نفرت وبیزاری:

حسّاسیت کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان کی طبیعت میں ظلم اور ظلم کرنے والوں سے شدید نفرت وبیزاری ہو؛ چنانچہ بخاری میں مروی ہے کہ بعض صحابہؓ نے اصحابِ حجر کی بستیوں سے گزرنا چاہا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا: اگر عذاب کے شکار لوگوں کی بستی سے گزر ہو تو روتے ہوئے گزرنا، اگر رونا نہ آئے تو مت گزرنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی عذاب کے شکار ہو جاؤ جو کبھی ان کو لاحق ہوا تھا۔(البخاری، کتاب الصلاۃ، رقم: ۴۳۳)۔

(۶) اللہ کی معصیت یا لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنے والے طرز عمل سے بیزاری:

حسّاسیت کی ایک اہم علامت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ کو ناراض کرنے والے عمل کا ارتکاب کرے تو آپ اس عمل سے بیزاری اور نفرت کا اظہار کریں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی ایسے طرز عمل میں مبتلا ہو جس سے لوگ دین سے متنفر یا دور ہو سکتے ہوں تب بھی یہ دین کے لیے حساسیت کا تقاضہ ہے کہ آپ اس طرز عمل سے شدید ناراضگی کا اظہار کریں؛ تاکہ دین کے مصالح متاثر نہ ہوں۔

مثال کے طور پر ایک مرتبہ ایک صحابی نے اپنے مقتدیوں کو بہت لمبی نماز پڑھائی، جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے اس قدر ناراضگی کے ساتھ وعظ ارشاد فرمایا کہ اتنے غصہ میں اس سے پہلے کبھی آپ کو وعظ

فرماتے ہوئے نہیں سنا گیا۔(صحیح البخاری، کتاب العلم، حدیث: ۹۰)

حساسیت کے تعلق سے سب سے زیادہ علماء جوابدہ ہیں

مؤمنین کے مسائل ومشکلات کے تعلق سے حساسیت کی ذمہ داری سب سے زیادہ علماء پر عائد ہوتی ہے، کیونکہ حسّاسیت کا تعلق دل کی خشیت اور رقت سے ہے، جو اصلاً علم ومعرفت ہی سے پیدا ہوتی ہے، چنانچہ اگر کوئی عالم اپنے علم کو اپنے کردار پر منطبق نہیں کرتا تو وہ خشیت ورقت اور حسّاسیت سے محروم رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے "اللهم إني أعوذبك من علم لا ينفع وقلب لا يخشع" میں علم غیر نافع کے فوراً بعد قلب غیر خاشع سے پناہ مانگی ہے؛ کیونکہ انسان کے علم کے غیر نافع ہونے کا ہی یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کا دل خشوع وخضوع، رقت وخشیت اور امت کے لیے حساسیت و فکرمندی سے خالی رہ جاتا ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کیونکہ سب سے زیادہ علم حاصل تھا اس لیے آپ کی رقت و حساسیت بھی اسی درجہ کی تھی۔

سلف صالحین اپنے علم وعمل کے درمیان تقابل وموازنہ کرتے رہتے تھے اور اپنے قلب کی حساسیت اور رقت کا برابر جائزہ لیتے رہا کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم تیمیؒ کا قول ہے کہ میں جب بھی اپنے اقوال ومعارف کو اپنے کردار وعمل کے مقابلہ میں رکھتا ہوں تو مجھے یہ خدشہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں میں غیر مؤمن تو نہیں ہوں۔

حساسیت سے محرومی کا سبب

قرآن میں دلوں کی بے حسی کا سبب بیان کرتے ہوئے خدا نے ارشاد فرمایا ہے: فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ۔(الحدید:۱۶) اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دلوں میں سختی اور قساوت تب پیدا ہوتی ہے جب اللہ کی آیات سے مضبوط تعلق نہ ہو اور ان کو پڑھنے کا مسلسل اہتمام نہ کیا جائے۔

اس کے بالمقابل دوسری آیت: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ ءَايَٰتُهُۥ زَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ۔(سورۃ الانفال:۲) سے پتہ چلتا ہے کہ جب اللہ کی آیات کی تلاوت وتدبر، آخرت کی فکر اور اللہ کے استحضار کا اہتمام رکھا جاتا ہے تو دلوں میں نرمی، رقت، حساسیت اور صفائی پیدا ہوتی ہے۔

دین کو آج ایسے افراد کی ضرورت ہے جو اس کی مشکلات کو اپنی ذاتی مشکلات سمجھیں۔اس کی ذمہ داریوں کو اپنے کاندھوں پر اٹھائیں اور اپنے کردار کی اہمیت کا شعور رکھیں۔

دین کو ہرگز ایسے گفتار کے غازیوں کی ضرورت نہیں جن کا کل سرمایہ شیریں کلامی اور شعلہ بیانی ہو۔

ہم سب کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ اللہ اور مسلمانوں کے تعلق سے ہمارے دلوں میں کتنی حساسیت ہے؟ اگر آپ کو خیر کے کام اور مسلمانوں کے تعلق سے اچھی خبریں مسرور کر دیتی ہیں، ساتھ ہی برے کام اور بری خبریں فکرمند اور مغموم کر دیتی ہیں تو مبارک ہو! کیونکہ یقیناً آپ مؤمنانہ خصوصیات کے حامل ہیں، آپ کا دل زندگی سے لبریز ہے اور آپ کے جذبات بیدار ہیں۔

☆☆☆

تحقیق وتنقید (قسط:۲۷)

اہلِ کتاب کے ایمان وکفر کے سلسلہ میں بعض مغالطے اوران کاازالہ

مولانا محمد غزالی ندویؒ
بانی: امام بخاری ریسرچ اکیڈمی

انیسواں مغالطہ: مفسرین نےمؤمنوا أھل الکتاب کی تعبیر استعمال کرکے اہل کتاب کی تعریف کی ہے

بعض لوگ یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ مختلف مفسرین نے اپنی تفاسیر میں مؤمنوا أھل الکتاب کی تعبیر استعمال کی ہے،اور مومن اہل کتاب کی تعریف کی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ مفسرین اس بات کو مانتے ہیں کہ اہل کتاب میں بھی کچھ لوگ مومن ہوتے ہیں۔

ازالہ: یہ محض ایک مغالطہ ہےاور خطرناک وگمراہ کن مغالطہ ہے؛اس لیے کہ جن مفسرین نے بھی یہ تعبیر استعمال کی ہے وہ ان اہل کتاب کے لیے کی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاکر مسلمان ہوگئے تھےاور آپ کی اتباع میں داخل ہو گئے تھے۔ مثلاً:

۱- أیسر التفاسیر میں {وَمَنْ عِندَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ} [الرعد:۴۳] کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: {وھم مؤمنوا أھل الکتاب من الیھود والنصاری کعبد اللہ بن سلام و سلمان الفارسی والنجاشی وتمیم الداری وغیرھم} ۔(ایسر التفاسیر،۳/۳۸،الرعد۴۳)

(اس سے مراد اہل کتاب یعنی یہود ونصاری میں سے وہ لوگ ہیں جو ایمان لے آئے تھے۔ جیسے: عبد اللہ بن سلام، سلمان فارسی، نجاشی اور تمیم داری وغیرہ)

۲- تفسیر روح البیان میں آیات کریمہ {الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِن قَبْلِهِ هُم بِهِ يُؤْمِنُونَ وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ} کے تحت لکھا ہے :"وھم مؤمنوا أھل الکتاب"(اس سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو ایمان قبول کر چکے تھے) پھر اُن کے بارے میں لکھا ہے:

"{أُولَٰئِكَ} الموصوفون بما ذکر من النعوت {يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم} ثوابھم فی الآخرۃ {مَّرَّتَيْنِ} مرۃ علی إیمانھم بکتابھم، و مرۃ علی إیمانھم بالقرآن۔ {بِمَا صَبَرُوا} أی بصبرھم و ثباتھم علی الإیمانین والعمل بالشریعتین"۔(روح المعانی،۶/۴۴۱-۴۴۲،القصص:۵۲-۵۴)

"یعنی مذکورہ بالا خصائل سے متصف اہل کتاب چونکہ پہلے اپنی کتابوں پر ایمان لائے، پھر قرآن (آیا تو اُس) پر ایمان لائے اور اُنھوں نے (یکے بعد دیگرے) دونوں شریعتوں پر عمل کرنے میں ثابت قدمی دکھائی؛اس لیے

ان کو آخرت میں دوہرا اجر ملے گا: ایک اجر تو اپنی کتابوں پر ایمان لانے کا اور دوسرا اجر قرآن پر ایمان لانے کا"۔

آگے {أعرضوا عنه} کے تحت ایسی بات لکھی ہے، جو فیصلہ کن انداز میں یہ ثابت کرتی ہے کہ مفسر کے نزدیک مؤمنی أهل الکتاب سے مراد اسلام لانے والے لوگ ہیں:

" {أعرضوا عنه} أي عن اللغو وذلك أن المشركين كانوا يسبون مؤمني أهل الكتاب، ويقولون: تبّاً لكم تركتم دينكم القديم فيعرضون عنهم ولا يشتغلون بالمقابلة"۔(حوالہ سابق)

"یعنی (یہ مومن اہل کتاب) لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ یہ بات اُن کے بارے میں اس لیے کہی گئی کہ مشرکین، اُن کو برا بھلا کہتے تھے، اور کہتے تھے: تم ہلاک ہو جاؤ کہ تم نے اپنا قدیم دین چھوڑ دیا، تو وہ لوگ ان سے اعراض برتتے اور مقابلہ آرائی نہ کرتے"۔

۳- ابن الجوزی نے اپنی تفسیر "زاد المسیر" میں {وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَٰبِ وَأَقَامُواْ الصَّلَوٰةَ} [الأعراف: ۱۷۰] کے ذیل میں لکھا ہے:

"وهذه الآية نزلت في مؤمني أهل الكتاب الذين حفظوا حدوده ولم يحرفوه، منهم ابن سلام و أصحابه"(زاد المسیر فی علم التفسیر: ۵۲۶، الاعراف: ۱۷۰)۔ "یہ آیت ان مومن اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی جنھوں نے کتاب اللہ کے احکام کی حفاظت کی، اور اس میں تحریف نہیں کی، جیسے بن سلام اور ان کے ساتھی۔"

خازن، ابن عادل، بغوی، ثعلبی اور شوکانی کی وضاحت

۴...۸- تفسیر الخازن"(۳/۲۷۲) "اللباب فی علم الکتاب"(۱۵/۳۶۲) "معالم التنزیل"(۶/۲۴۹)، "الکشف والبیان"(تفسیر الثعلبی: ۷/۲۸۵) اور "فتح القدیر"(۴/۲۰۷) میں {فَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَٰبَ يُؤْمِنُونَ بِهِ} کے ذیل میں لکھا ہے: "يعني مؤمني أهل الكتاب كعبد الله بن سلام وأصحابه"

"یعنی اس سے مراد ایمان قبول کرنے والے اہل کتاب ہیں۔ جیسے عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھی"۔

اس عبارت میں عبد اللہ بن سلام کی مثال دینا اس بات کی وضاحت ہے کہ ان مفسرین کے نزدیک "مؤمني أهل الكتاب" سے مراد وہ یہود و نصاری ہیں جو اسلام لے آئے تھے۔ ابن عادل نے {وَمَنْ عِندَهُۥ عِلْمُ الْكِتَٰبِ} کے ذیل میں بھی "مؤمني أهل الكتاب" کا تذکرہ کیا ہے، اور مثال میں عبد اللہ بن سلام کے ساتھ سلمان فارسی اور تمیم داری کا بھی نام لیا ہے: "المراد: شهادة مؤمني أهل الكتاب، كعبد الله بن سلام وسلمان الفارسي وتميم الداري"۔(اللباب فی علم الکتاب: ۱۱/۳۲۶، الرعد: ۴۳)"مطلب یہ ہوگا کہ مومن اہل کتاب بھی شہادت دیتے ہیں۔ جیسے عبد اللہ بن سلام، سلمان فارسی اور تمیم داری"۔

۹- "تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس" میں {الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَٰبَ يَعْرِفُونَهُۥ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ} کے ذیل میں لکھا ہے: "ثم ذكر مؤمني أهل الكتاب فقال: {الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَٰبَ} أعطينا هم علم

التوراة،عبد اللہ بن سلام وأصحابہ۔ (یعرفونہ) یعرفون محمّداً ﷺ بصفتہ ونعتہ"۔(تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس: ۲۵،البقرۃ: ۱۴۶)۔

"پھر مومن اہل کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: "جن کو ہم نے کتاب دی" یعنی تورات کا علم دیا، جیسے: عبد اللہ من سلام اوران کے ساتھی، وہ ان کو یعنی محمد ﷺ کو ان کے اوصاف سے پہچانتے ہیں"۔

مفسر ابو حیان اور علامہ آلوسی کی وضاحت

۱۰- "تفسیر البحر المحیط" کے مصنف ابو حیان محمد بن یوسف بن علی بن یوسف بن حیان، اور علامہ آلوسیؒ نے {وَالَّذِيْنَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُونَ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ} کے ضمن میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی مؤمنی أھل الکتاب سے مراد اسلام قبول کرنے والے یہودی اور عیسائی ہیں۔ابو حیان لکھتے ہیں:

"نزلت فی مؤمنی أھل الکتابین، ذکرہ الماوردی، واختارہ الزمخشری، فقال: من أسلم من الیھود کعبد اللہ بن سلام و کعب و أصحابھا،ومن أسلم من النصاری، وھم ثمانون رجلاً، أربعون من نجران، وثمانیۃ من الیمن، واثنان وثلاثون من الحبشۃ ... وعن ابن عباس وزید: فی مؤمنی الیھود، کعبد اللہ بن سلام وأصحابہ"۔(البحر المحیط: ۳۸۶/۵،الرعد: ۳۶)"یہ آیت مومنین اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ماوردی کی یہی رائے ہے، اور زمخشری نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ: ان سے مراد: وہ یہود ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے۔ جیسے عبد اللہ بن سلام، کعب احبار اور ان کے دونوں رفقا۔اسی طرح وہ نصاری بھی مراد ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے، اور وہ اسّی تھے۔ چالیس نجران سے تھے، آٹھ یمن سے اور بتیس حبشہ سے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت زید سے بھی مروی ہے کہ یہ آیت ایمان لانے والے یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جیسے عبد اللہ بن سلام اور ان کے رفقا"۔

۱۱- اسی کے مثل عبارت علامہ آلوسی نے بھی روح المعانی میں لکھی ہے:

"{وَالَّذِيْنَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتٰبَ} نزلت - کما قال الماوردی- فی مؤمنی أھل الکتابین کعبد اللہ بن سلام، و کعب، وأضرا بھما من الیھود، وکالذین أسلموا من النصاری"۔(روح المعانی: ۱۵۶/۵، الرعد: ۳۶)۔"یہ آیت جیسا کہ ماوردی نے کہا ہے: مؤمن اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جیسے عبد اللہ بن سلام، کعب احبار اور ان جیسے دیگر یہود۔اسی طرح وہ نصاری جو مسلمان ہو گئے تھے"۔

۱۲- تفسیر ابن ابی حاتم میں ہے کہ بعض مومن اہل کتاب محمد ﷺ پر ایمان لانے کے بعد بھی اپنی پچھلی شریعت کی کچھ چیزوں پر عمل کر رہے تھے، تو اُنھیں اِس سے روکا گیا اور کہا گیا کہ اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ:

"{يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً}یعنی مؤمنی أھل الکتاب،فإنھم کانوا مع الإیمان باللہ

مستمسكين ببعض أمر التوارة والشرائع التي نزلت فيهم۔ وروى عن مقاتل بن حيان، أنه قال: عبد الله بن سلام ومؤمنوا أهل الكتاب۔ عن ابن عباس قال: قال الله تعالى: {أُدۡخُلُواْ فِي السِّلۡمِ كَآفَّةً}يقول: أدخلوا في شرائع دين محمدﷺ، ولا تدعوا منها شيئاً، وحسبكم الإيمان بالتوراة وما فيها''۔(تفسیر ابن ابی حاتم: ۳۶۹/۱-۳۷۰)''اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ''۔یعنی مومن اہل کتاب؛ کیونکہ وہ لوگ ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ تورات کے بعض احکام و شرائع کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے، جو ان کے لیے نازل کیے گئے تھے۔مقاتل بن حیان سے مروی ہے کہ: اس سے مراد عبد اللہ بن سلام اور دوسرے مومن اہل کتاب ہیں۔... حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ {أُدۡخُلُواْ فِي السِّلۡمِ كَآفَّةً}کا مطلب یہ ہے کہ تم سب کے سب دین محمد کے قوانین میں داخل ہو جاؤ، اور اس کی کوئی چیز چھوڑو نہیں۔اور تمھارے لیے تورات اور اس کے احکام پر محض ایمان لانا کافی ہے''۔

۱۳- ابن عاشور نے بھی التحریر والتنویر میں ''مؤمنوا أهل الكتاب''ان ہی لوگوں کو قرار دیا ہے جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہو گئے تھے۔وہ {وَالَّذِينَ يُؤۡمِنُونَ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيۡكَ} کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ذكر فريقاً آخر من المتقين، وهم الذين آمنوا بما أنزل من الكتب الإلهية قبل بعثة محمدﷺ، ثم آمنوا بمحمد، وهؤلاء هم مؤمنوا أهل الكتاب، وهم يومئذ اليهود الذين كانوا كثيرين في المدينة وما حولها في قريظة والنضير وخيبر، مثل عبد الله بن سلام، وبعض النصارى مثل صهيب الرومي ودحية الكلبي، وهم وإن شاركوا مسلمي العرب في الا هتداء بالقرآن والإيمان بالغيب وإقامة الصلاة، فإن ذلك كان من صفاتهم قبل مجيء الإسلام۔ فذكرت لهم خصلة أخرى زائدة على ما وُصف به المسلمون الأولون''۔(التحریر والتنویر: ۲۳۷/۱، البقرة: ۴)

''اس آیت میں اللہ تعالی نے متقین کی ایک دوسری جماعت کا تذکرہ کیا ہے۔اور یہ وہ لوگ ہیں جو بعثت محمدی سے پہلے دیگر آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے تھے۔ پھر محمد ﷺ پر ایمان لائے۔یہی مومنین اہل کتاب ہیں، اور یہ اس وقت یہود تھے، جن کی مدینہ اور آس پاس کے علاقوں، قریظہ، نضیر اور خیبر میں بڑی تعداد تھی۔ جیسے عبد اللہ بن سلام اور بعض نصاری،... جیسے صہیب رومی اور دحیہ کلبی۔یہ لوگ اگرچہ مسلمانان عرب کی طرح قرآن سے ہدایت حاصل کرتے تھے۔غیب پر ایمان رکھتے تھے۔نماز پڑھتے تھے؛اس لیے کہ اسلام کی آمد سے پہلے یہ ان کے اوصاف تھے؛ لیکن ان کی ایک الگ خصوصیت اور خصلت کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو سابقین مسلمانوں کے اوصاف میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے''۔

۱۴- سمرقندی نے بھی مؤمني أهل الكتاب کی مثال میں عبد اللہ بن سلام کو پیش کیا ہے۔ {اللَّهُ نَزَّلَ أَحۡسَنَ الۡحَدِيثِ} کے ذیل میں انھوں نے لکھا ہے:

"وذلك أن المسلمين قالوا لبعض مؤمني أهل الكتاب نحو عبد الله بن سلام: أخبرنا عن التوراة، فإن فيها علم الأولين والآخرين، فأنزل الله تعالى: {ٱللَّهُ نَزَّلَ أَحۡسَنَ ٱلۡحَدِيثِ} يعني: أنزل عليكم أحسن الحديث و هو القرآن، ويقال {أَحۡسَنَ ٱلۡحَدِيثِ} يعني: أحسن من سائر الكتب، لأن سائر الكتب صارت منسوخة بالقرآن"۔(تفسیر السمرقندی المسمی بحر العلوم، ۱۴۸/۳، الزمر:۲۳)۔

"وہ اس لیے کہ مسلمانوں نے عبد اللہ بن سلام جیسے بعض مومنین اہل کتاب سے کہا کہ ہمیں تورات کے بارے میں کچھ بتاؤ؛ کیوں کہ اس میں اولین وآخرین کا ذکر ہے، تواللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اللہ نے تم پر سب سے اچھی گفتگو (کتاب) قرآن کی شکل میں نازل کر دی ہے"۔اور أحسن الحديث سے مراد یہ ہے کہ تمام کتابوں میں سب سے بہتر اور خوب صورت کتاب نازل کر دی ہے؛ کیوں کہ قرآن کے ذریعے ساری کتابیں منسوخ ہو گئیں"۔

۱۵- ابن عطیہ نے بھی المحرر الوجیز میں "مؤمنوا أهل الكتاب" کی تعبیر استعمال کی ہے۔ اور اُس سے عبد اللہ بن سلام ہی جیسے لوگوں کو مراد لیا ہے۔ {والَّذِينَ يُؤۡمِنُونَ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيۡكَ وَمَآ أُنزِلَ مِن قَبۡلِكَ} کی تفسیر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:"اختلف المتأولون فيمن المراد بهذه الآية وبالتي قبلها، فقال قوم: الآيتان جميعاً في جميع المؤمنين۔ وقال آخرون: هما في مؤمني أهل الكتاب۔ وقال آخرون: الآية الأولى في مؤمني العرب، والثانية في مؤمني أهل الكتاب، كعبد الله بن سلام، وفيه نزلت"۔(المحرر الوجیز:۱/۸۵-۸۶، البقرہ:۴)۔"مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس آیت اور ما قبل کی آیت سے کون لوگ مراد ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ دونوں آیتوں میں تمام ہی عام مومنین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور دوسرے کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ ان دونوں آیتوں کی مراد مومن اہل کتاب سے ہے۔ اور تیسرے گروہ کا کہنا ہے کہ پہلی آیت میں مومنین عرب کا تذکرہ ہے، اور دوسری میں مومنین اہل کتاب۔ مثلاً: عبد اللہ بن سلام وغیرہ کا، اور انھی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔"

۱۶- امام واحدی نے بھی اپنی کتاب أسباب النزول میں {ٱلَّذِينَ ءَاتَيۡنَٰهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ يَعۡرِفُونَهُۥ كَمَا يَعۡرِفُونَ أَبۡنَآءَهُمۡ} کے تحت لکھا ہے:

"نزلت في مؤمني أهل الكتاب: عبد الله بن سلام وأصحابه"(اسباب نزول القرآن:۴۷، البقرہ:۱۴۶)۔"یہ آیت مومنین اہل کتاب: عبد اللہ بن سلام اور ان کے رفقا کے بارے میں نازل ہوئی"۔

اب یہ آخری درجے کی تلبیس ہے کہ مفسرین تو مؤمني أهل الكتاب سے مراد عبد اللہ بن سلام اور ان جیسے اسلام قبول کرنے والے افراد کو لیں، اور ان کی تعریف کریں، اور کوئی سیاق وسباق کو کاٹ کر ان تمام تعریفوں کا مصداق یہود ونصاری کو قرار دے دے۔ اور پھر ڈھٹائی سے یہ کہہ دے کہ مفسرین بھی یہود ونصاری کے مداح ہیں۔ یہ تو ایسا ہی

ہے جیسے کوئی قادیانی یہ کہے کہ سارے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ غلام احمد قادیانی نبی تھا، اور وہ اس طرح کہ سب نے {يٰبَنِيٓ إِسْرَآءِ يْلَ إِنِّيْ رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّراً بِرَسُولٍ يَأْتِيْ مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ} [الصف:٦] کا مطلب یہ بتایا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میرے بعد ایک نبی آئیں گے، جن کا نام احمد ہوگا، اور وہ غلام احمد قادیانی ہے۔ تو اس کے جواب میں یہی عرض کیا جائے گا کہ بلاشبہ سارے مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنے بعد احمد نامی نبی کے آنے کی بشارت دی تھی؛ لیکن تمام مفسرین نے احمد سے مراد حضرت محمد کو لیا ہے، نہ کہ غلام احمد قادیانی کو۔ اسی طرح ہم عرض کرتے ہیں کہ بلاشبہ تمام مفسرین نے تو مؤمني أهل الكتاب کی تعریف نقل کی ہے؛ لیکن سب نے یہ صراحت کی ہے کہ اس سے مراد محمد ﷺ کی اتباع میں داخل ہونے والے اہل کتاب تھے۔ جیسے: عبداللہ بن سلام وغیرہ۔ پھر ان کے اقوال سے اپنے مطلب کا استدلال کرنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟

بیسواں مغالطہ: {لَنَآ أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ}

بعض لوگ اس آیت اور اس جیسی دوسری آیات پیش کر کے یہ کہتے ہیں کہ اہل کتاب کے تعلق سے قرآن نے ہمیں یہ اخلاق سکھائے ہیں کہ ہم ان کے کفر اور ان کی غلطیوں کو واضح کرنے اور انھیں اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کے بجائے صرف اپنے اعمال پر توجہ دیں۔

ازالہ

(۱) جس آیت کا یہ ٹکڑا ہے اس کی ابتدا ہی اس بات سے کی گئی ہے کہ آپ ﷺ کو خود بھی اپنے لائے ہوئے دین پر جمے رہنا ہے، اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتے رہنا ہے: {فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ} [الشوری:۱۵]۔ ”لہذا (اے پیغمبر!) تم اسی بات کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہو، اور جس طرح تمھیں حکم دیا گیا ہے، (اسی دین پر) جمے رہو اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلو، اور کہہ دو کہ میں تو اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل کی ہے۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہمارا بھی رب ہے، اور تمھارا بھی رب۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں، اور تمھارے اعمال تمھارے لیے“۔

(۲) ان جیسی آیات کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہوتا کہ دوسروں کے غلط اعمال پر ٹوکا نہ جائے۔ کافروں کے کفر کو واضح نہ کیا جائے۔ کسی کو کافر نہ کہا جائے؛ بلکہ یہ اور اس جیسی دوسری تعبیرات کا منشا صرف اتنا ہوتا ہے کہ اگر تم ہماری بات نہیں مانتے، تو تم اپنا ہی نقصان کر رہے ہو، اس سے ہمارا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ تم اپنے اعمال لے کر خدا کے سامنے حاضر ہوگے اور ہم اپنے اعمال لے کر۔ اس طرح کے الفاظ قرآن نے خود مشرکین کے لیے بھی استعمال کیے ہیں؛ لیکن ان سے کبھی یہ مطلب نہیں نکالا گیا کہ انھیں کافر نہ سمجھا جائے۔ ایک جگہ ہے:

{وَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل لِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ أَنتُمْ بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ}
[یونس:۴۱]۔"اور (اے پیغمبر!) اگر یہ تمھیں جھٹلائیں، تو (ان سے) کہہ دو کہ: "میرا عمل میرے لیے ہے اور تمھارا عمل تمھارے لیے۔ جو کام میں کرتا ہوں، اس کی ذمے داری تم پر نہیں ہے۔ اور جو کام تم کرتے ہو۔ اس کی ذمے داری مجھ پر نہیں"۔

ایک جگہ کافروں کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا: {قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ} [الکافرون:۱-۶]۔"تم کہہ دو کہ: "اے حق کا انکار کرنے والو! میں ان چیزوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ میں (آئندہ) اس کی عبادت کرنے والا ہوں، جس کی عبادت تم کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمھارے لیے تمھارا دین ہے، اور میرے لیے میرا دین"۔

(۳) حضرت محمد ﷺ سے بے شک کہا گیا ہے کہ وہ اہل کتاب سے کہہ دیں: {لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ} لیکن اس کا اگر یہ مطلب ہوتا کہ آپ ﷺ اہل کتاب کو اُن کی غلطیوں پر نہ ٹوکیں اور اُن کو اپنی اتباع کی دعوت نہ دیں، تو سورۂ مائدہ، آیت:۱۹ میں اہل کتاب سے یہ نہ کہا جاتا کہ دیکھو ہمارا رسول تمھارے سامنے حق کی وضاحت کر رہا ہے، اسے قبول کر لو۔ پھر نہ کہنا کہ کوئی رسول نہیں آیا تھا۔ اسی طرح دوسری بہت سی آیات میں آپ ﷺ کو یہ حکم نہ دیا جاتا کہ اہل کتاب کو اُن کی غلطیوں پر متنبہ کریں، اور اُن سے پوچھیں کہ وہ خدا کے کلام کو کیوں نہیں مان رہے ہیں اور دوسروں کو اُس سے کیوں روک رہے ہیں؟

{قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنتُمْ شُهَدَاءُ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ} ۔[آل عمران:۹۸-۹۹] "کہہ دو کہ: "اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو؟ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سب کا گواہ ہے۔ کہہ دو کہ: "اے اہل کتاب! اللہ کے راستے میں ٹیڑھ پیدا کرنے کی کوشش کر کے ایک مومن کے لیے اس میں کیوں رکاوٹ ڈالتے ہو، جب کہ تم خود حقیقت حال کے گواہ ہو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے"۔

خلاصہ یہ کہ {لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ} سے جو نظریہ برآمد کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اُس میں دیگر قرآنی تصریحات کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔

☆☆☆

قضیۂ فلسطین

فلسطین پر مسلمانوں کا دینی، تاریخی اور شرعی حق

محمد انس
متعلم: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

(نوٹ: قضیہ فلسطین کے متعلق ایک مسابقہ (مضمون نگاری) کا انعقاد کیا گیا، اس مسابقہ کا اہتمام انجمن ابنائے قدیم مدرسۃ العلوم الاسلامیہ نے کیا، مسابقہ کے لیے دو موضوعات متعین کیے گئے تھے جو دو الگ گروپوں کے لیے تھے، اعلان کیا گیا تھا کہ پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کے مقالات 'ندائے اعتدال' میں شائع کیے جائیں گے۔ چنانچہ اس شمارے میں گروپ (ب) میں سوم انعام حاصل کرنے والے طالب علم کا مقالہ شائع کیا جارہا ہے۔ ادارہ)

آغاز سخن

فلسطین وہ سرزمین ہے جس کو قرآن مجید میں مقدس اور بابرکت قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: ''سبحٰن الذی أسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ'' [الاسراء:۱] (پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی، جس کے ارد گرد ہم نے برکت رکھی ہے۔)

ایک اور مقام پر فرمایا گیا: ''وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ''۔ [الانبیاء:۷۱]، (ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کو اس سرزمین کی طرف پناہ دی جس میں ہم نے دنیا جہاں والوں کے لیے برکت رکھی ہے۔)

فلسطین مسلمانوں کا قبلۂ اولیٰ ہے، معراج کے واقعہ کی داستان کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انبیاء کی امامت یہاں فرمائی ہے، یہاں انبیاء کا مدفن ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہیں پیدا ہوئے، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاقؑ نے یہاں دفن کیے جانے کی وصیت کی۔ اسی جگہ حضرت مریمؑ کی وفات ہوئی تھی، اسی جگہ حضرت زکریاؑ کو حضرت یحیٰ علیہ السلام کی بشارت دی گئی تھی۔ الغرض مسلمانوں کے تمام دینی جذبات اس سے وابستہ ہیں اور پھر اسلام کی پوری تاریخ میں ایک مختصر زمانہ کے سوا یہ سرزمین مستقل مسلمانوں کی تولیت میں رہی ہے۔

حضرت عمرؓ نے ۱۰ھ/۶۳۶ء کو فلسطین فتح کیا تھا، اس سے پہلے یہ عیسائیوں کے قبضے میں تھا، ۱۰۹۶ء میں پہلا صلیبی حملہ اس پر ہوا، جس کے بعد ۹۰ سال تک وہ انھی کے قبضے میں رہا، پھر صلاح الدین ایوبی کے ذریعہ ۹۰ سال کے بعد ۱۱۸۷ء (۵۸۳ھ) میں فلسطین دوبارہ صلیبی تسلط سے آزاد ہوا، صرف اتنے مختصر سے وقفہ کے علاوہ فلسطین ہمیشہ سے مسلمانوں کے زیرِ اقتدار رہا اور مسلمان ہی اس کے والی ومالک رہے ہیں، اس کا کوئی اعتبار نہیں کہ ۱۹۴۷ء میں اسرائیل نے صہیونی ریاست قائم کرکے زبردستی اس پر قبضہ کرلیا۔

فلسطین پر دینی، تاریخی، شرعی وقانونی بہر اعتبار مسلمانوں کا حق ہے۔ مسلمانوں کے دینی جذبات اس سے وابستہ ہیں، ان کی تاریخ اس سے وابستہ ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''عن ابی

هريرة رضي الله عنه ان رسول الله ﷺ قال: لا تشد الرحال الا ثلاثة مساجد المسجد الحرام، و مسجد الرسول، و مسجد الاقصىٰ۔" حضور ﷺ نے اس کے لیے شد رحال کا جواز فراہم کیا ہے، اس کے علاوہ حضور ﷺ کی خاصی روایات اس کی عظمت وفضیلت اور اس کے مقام و مرتبہ کو ثابت کرنے کے لیے وارد ہیں:

یہود کے دعوے کہ وہ ان کی 'ارضِ موعود' ہے اور وہ اس سرزمین کے اصل باشندے ہیں، ان کا اس پر سب سے زیادہ حق ہے، یہ تمام دعوے بالکل بے بنیاد اور باطل ہیں، وہ انبیا کے وارث خود کو کہتے ہیں؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ انبیاء کے قاتل ہیں، ان کی بابت قرآن مجید نے کہا: "ذلك بأنهم كانوا يكفرون بآيات الله يقتلون النبيين بغير الحق۔ [البقرۃ: ۶۱]۔ (ایسا اس لیے ہے کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، ناحق انبیاء کا قتل کرتے ہیں۔)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا: "وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللهِ" [التوبۃ: ۳۰]

(اور یہود کہتے ہیں کہ عزیرؑ اللہ کے بیٹے ہیں، انھوں نے شرک کیا، بچھڑے کی پوجا کی۔)

یہود کا بالآخر خاتمہ ہوگا، ان کا زوال طے ہے، حضور ﷺ نے فرمایا تھا: "عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال: لا تقوم الساعة حتى يقاتل المسلمون اليهود، فيقتلهم المسلمون حتى يختبئ اليهودي من وراء الحجر و الشجر، فيقول الحجر أو الشجر يا مسلم، يا عبد الله، هذا يهودي خلفي فتعال فاقتله إلا الغرقد، فإنه من شجر اليهود۔" [متفق علیہ]۔ (حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ مسلمان یہودیوں سے جنگ نہ کرلیں، یہاں تک کہ (اس دوران) اگر کوئی یہودی درخت یا پتھر کے پیچھے چھپ جائے گا تو درخت یا پتھر کہیں گے کہ اے مسلم، اے عبد اللہ! یہ یہودی میرے پیچھے ہے آؤ اور اس کو قتل کردو، سوائے غرقد کے کہ وہ یہودیوں کا درخت ہے۔)

میرے اس مقالہ میں اسی پر بحث کی گئی ہے کہ فلسطین کا اصل حق دار کون ہے؟ یہودی یا مسلمان؟ جس میں یہودیوں کے دعووں کا جائزہ لیا گیا ہے، پھر مسلمانوں کے حق کو دلائل کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے، جس سے کسی حد تک مسئلہ کی نوعیت سامنے آجاتی ہے۔

فلسطین پر مسلمانوں کا دینی حق

یہود کیا دعویٰ کرتے ہیں؟

یہود کا دعویٰ ہے کہ وہ اسرائیل کی ریاست بناکر خدا کے اس دعوے کو پورا کر رہے ہیں جو ان سے کیا گیا۔

(To your descendants I give this land from the Wadi of Egypt to the Great river the euphrates the land of the Kenites, Kenizzites, Kadmonites, Hittites, Perizzites, Rephaites, Amorites, Canaanites, Girgashites and Jebusites.)[1]

(یعنی میں آپ کی اولاد کو یہ ملک مصر کی وادی سے لے کر دریائے فرات تک دیتا ہوں، قینیوں، کنیزیوں،

قدمو ینوں، حتیوں، فرزّیوں، رفائیوں، اموریوں، کنعانیوں، گرگاسیوں اور یبوسیوں کا ملک۔)

اس دعوے کے مطابق وہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت ابراہیمؑ کے وارث ہیں اور ہم اس زمین کے زیادہ حق دار ہیں۔

- سب سے پہلی بات یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل کو یہ زمین دینے کا وعدہ کیا گیا تو اس میں دونوں بیٹے شامل ہیں۔ حضرت اسحاق جن کے لڑکے یعقوب ہیں، جن کو اسرائیل بھی کہتے ہیں ان سے بھی یہ وعدہ ہے اور حضرت اسماعیلؑ سے بھی۔
- انبیاء کی وراثت کے مستحق وہی لوگ ہوتے ہیں، جو ان کی اتباع کریں اور ان پر ایمان لائیں اور ظلم نہ کریں۔ حضرت ابراہیمؑ کے وارث بھی وہی ہوں گے جو ان پر ایمان لائے اور ان کی اتباع کی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ''۔ [آل عمران: ۶۸]۔(لوگوں میں ابراہیمؑ سے سب سے زیادہ قریب ابراہیمؑ کی پیروی کرنے والے، یہ نبی (محمد ﷺ) اور ان پر ایمان لانے والے لوگ ہیں۔)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: '' وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ''[البقرۃ: ۱۲۴]۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کی آزمائش میں کھرے اترے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو منصبِ امامت عطا کرنے کو کہا، تو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کے لیے بھی سوال کیا، جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ لا ینال عهد الظالمین یعنی ظالمین کے حق میں میرا وعدہ نہیں ہوگا۔ کیا یہودی ظالمین میں سے نہیں ہیں؟ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بعل نام بت بنالیا اور اس کی پوجا کی یعنی اللہ تعالیٰ کا صریح انکار کیا، مزید حضرت زکریاؑ اور حضرت یحیٰ علیہ السلام کا قتل کیا، حضرت لوطؑ پر الزام لگایا کہ وہ العیاذ باللہ، اپنی بیٹیوں کے ساتھ زنا کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کو ولد الزنا قرار دیا۔ حضرت عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا قرار دیا۔ اس کے علاوہ بے شمار جرائم ہیں جن کے یہود مرتکب ہیں، جن کے باعث قرآن میں ان کو ملعون قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا ان تمام مظالم کے نتیجے میں وہ اللہ کے اس قول لا ینال عهد الظالمین کے مصداق قرار پاتے ہیں اور اللہ کے وعدہ کے مستحق نہیں ٹھہرتے۔

- قرآن کریم کی یہ آیت يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ۔ [المائدہ:۲۱] سے بعض لوگوں کو مغالطہ ہو جاتا ہے کہ یہ زمین بنی اسرائیل ہی کے لیے لکھ دی گئی ہے؛ لیکن اس کے ساتھ آگے ہی یہ قید بھی لگادی گئی تھی کہ ان کو یہ زمین لڑ کر لینی پڑے گی۔ جب کہ انھوں نے لڑنے سے انکار کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کو نہیں مانا؛ بلکہ ان کے جواب میں کہا: یا موسیٰ ان فیھا قوماً جبّارین۔ [المائدۃ: ۲۲]۔(اے موسیٰ اس زمین پر تو بڑی زبردست قوم آباد ہے)۔ مزید انھوں نے یہ کہا: يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ۔ [المائدۃ: ۲۴]۔(اور اے

موسیٰ ہم اس میں کبھی داخل نہیں ہوں گے۔ جب تک وہ لوگ اس میں آباد ہیں۔ سو آپ اور آپ کے خداوند جائیں اور آپ دونوں لڑیں بھڑیں، ہم تو یہاں سے ٹلتے نہیں۔)

جس کو تورات میں ان کی زبان سے یوں ادا کیا گیا ہے۔ ''وہ لوگ جو وہاں بستے ہیں، زور آور ہیں، اور ان کے شہر بہت مضبوط قلعوں میں ہیں اور ہم نے بنی عناق کو بھی وہاں دیکھا اور اس زمین میں دکن کی جانب عمالیقی بستے ہیں، ہمیں زور نہیں کہ ہم ان لوگوں پر چڑھیں؛ کیوں کہ وہ ہم سے زیادہ زور آور ہیں۔'' (۲)

بائبل میں ایک مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے: ''بنی اسرائیل نے خداوند کے آگے بدی کی اور بعلیم کی پرستش کرنے لگے اور انھوں نے خداوند اپنے باپ دادا کے خدا کو جو انھیں مصر سے نکال کر لایا تھا، چھوڑ دیا اور دوسرے معبودوں کی جو ان کے ارد گرد کی قوموں کے دیوتاؤں میں سے تھے، پیروی کرنے اور ان کو سنجیدہ کرنے لگے اور خداوند کو غصہ دلایا، وہ خداوند کو چھوڑ کر عستارات کی پرستش کرنے لگے اور خداوند کا قہر اسرائیل پر بھڑکا (۳)

- جو لوگ انجیل کو عطائے ربانی مانتے ہیں ان میں بھی 'ویزلے مذہبی مدرسہ' کے ڈاکٹر ڈیوی. بیگل جیسے لوگ موجود ہیں، جو کہتے ہیں کہ قدیم یہودیوں نے الٰہی احکامات کی خلاف ورزی کر کے اپنے اس حق کو کھو دیا تھا۔ (۴)
- عہد نامہ قدیم میں ان کو بار بار دھمکی دی گئی ہے کہ: (Behold I will bring evil upon this palace which whosever hearth his ears shall tingle.) (۵) (بنی اسرائیل کو یہ دھمکی دی گئی کہ اللہ ان کو یروشلم کو پارہ پارہ کر دے گا، وہ دوبارہ کبھی متحد نہ ہو سکیں گے اور ان کا ایسا قتلِ عام ہوگا کہ قبر کی جگہ تک باقی نہ رہے گی۔)

اس پوری بحث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہود ظالم ہیں اور اللہ کے غضب کے مستحق ہیں، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت کے بھی مستحق نہ ہو کر فلسطین کے وارث نہیں ہیں اور مسلمان ہی حضرت ابراہیمؑ کے حقیقی وارث ہیں؛ کیوں کہ وہی حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لائے اور صحیح طور پر ان کی اتباع کی، جس کو اللہ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔ اور اس آیت کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ ''إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ'' [آل عمران: ۶۸]۔ اور مسلمان ہی اللہ کے نیک بندے ہیں اور اس سرزمین کے وارث صرف نیک ہی لوگ ہوں گے، جس کو اللہ نے لکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ'' [الانبیاء: ۱۰۵]۔ (اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے۔)

فلسطین پر مسلمانوں کا تاریخی حق

فلسطین کے بارے میں یہودیوں کا تاریخی اعتبار سے یہ دعویٰ ہے کہ وہ وہاں کے قدیم ترین باشندے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے، جس کو ہم ذیل میں واضح کریں گے۔

- طوفانِ نوح کے بعد جو قومیں ''اممِ سامیہ'' کے نام سے جانی گئیں وہ جغرافیائی اور نسلی طور پر عرب ہیں۔ اور ان

کا اولین مسکن عرب تھا، جس کے حدود مشرق میں خلیجِ عقبہ اور فلسطین تک اور شمالِ مشرق میں نہرِ فرات تک جا ملتے ہیں، جنسی اور تاریخی اعتبار سے یہ سارا علاقہ عرب کہلاتا تھا۔(۶)

- یہودیوں کا دعویٰ وہاں کے اصل عرب باشندوں کے حق کے سامنے بے بنیاد ثابت ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ فلسطینی باشندوں نے اس سرزمین کو مملکتِ داؤد سے پندرہ سو سال قبل آباد کیا تھا اور اس دوران میں بھی وہاں آباد رہے اور اس وقت بھی جب ان کا اس سرزمین سے انقطاع رہا اور آج تک مسلسل آباد ہیں۔(۷)
- فلسطین میں آباد ہونے والی سب سے قدیم ترین معروف قوم "کنعانی" ہے، جو جزیرۃ العرب سے تقریباً ۴۵ سو سال قبل آئے، اس لیے فلسطین پہلے "ارضِ کنعان" کے نام سے موسوم تھا۔ موجودہ فلسطینی ان ہی کنعانیوں کی نسل سے ہیں۔ پھر ان ہی کنعانیوں کے ساتھ "اموری قوم" بھی آباد ہوئی، اس کے بعد ان کے ساتھ بحرِ متوسط کے مشرق کی قومیں "بلست" یا "فسلطینی" اور دیگر عرب قبائل بھی ملتے گئے، جزیرۃ العرب سے شمال کی جانب ہجرت کرنے والے عرب قبائل میں "یبوسی" قبیلہ بھی ہے اور یہ قبیلہ "القدس" میں جا بسا۔ یہ القدس شہر کی تعمیر سے پہلے کی بات ہے۔ اس لیے القدس کو ان کی جانب منسوب کرتے ہوئے یبوس بھی کہا گیا ہے۔ فلسطین کے ان ہی اصل باشندوں کی اکثریت نے اسلام قبول کیا اور ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی عربی ہو گئی، جس سے فلسطین کی اسلامی شناخت تاریخ کے طویل ترین ادوار میں رہی۔(۸)
- یہودیوں نے فلسطین پر بلکہ اس کے بھی بعض اجزاء پر صرف چار صدیوں تک حکومت کی ہے۔ (۱۰۰۴-۵۸۶ م) اور ان کی حکومت بھی دوسرے لوگوں کی طرح ختم ہو گئی، لیکن فلسطینی قوم اپنی سرزمین پر ہمیشہ آباد رہی۔
- فلسطین میں اسلامی حکومت کا دور سب سے طویل ہے، جو عیسائی اقتدار کے نوے سال کو چھوڑ کر تقریباً ۱۲۰۰ سال (۶۳۶ - ۱۹۱۷ م) تک مسلسل رہا ہے۔
- خود یہودیوں کے "آرتھر کوسٹلر" جیسے معروف محققین کی تحقیقات کے مطابق معاصر یہودیوں میں سے ۸۰% فیصد یہودیوں کا فلسطین سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسی طرح قومی و نسلی اور تاریخی اعتبار سے بھی بنی اسرائیل سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیوں کہ موجودہ یہودیوں کی اکثریت کا تعلق "الخزر" یہودی نسل، اشکناز سے ہے اور یہ تاتاری (قدیم ترکی) قبائل ہیں، جو قوقاز کے شمال میں مقیم ہیں اور انھوں نے آٹھویں صدی مسیح میں یہودیت کو اختیار کیا، اگر ان یہود کو اپنے وطن واپس لوٹنے کا کوئی حق ہے تو وہ فلسطین کی جانب نہیں، بلکہ جنوبی روس کی جانب ہے۔(۹)
- مسلمانوں نے جب حضرت عمرؓ کے دور میں بیت المقدس کو فتح کیا تو وہاں کے اسقفِ اعظم نے ان کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ "ایلیاء" میں کبھی کسی یہودی کو داخل نہیں ہونے دیں گے۔ مسلمان جب وہاں داخل ہوئے تو شہرِ قدس میں ایک یہودی نہیں تھا، رومیوں نے ان کا صفایا کر دیا تھا۔(۱۰)
- یہودیوں کا یہ مفروضہ کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ورثہ کے مستحق ہیں۔ اگر بالفرض اس کو مان بھی لیا

جائے تو حضرت ابراہیمؑ، ان کے بیٹے اسحاقؑ اور پوتے یعقوبؑ کی فلسطین میں پوری مدت قیام ۲۳۰ سال پر محیط ہے۔ لیکن اس پوری مدت میں ان کی ملکیت میں ایک گز زمین نہ تھی نیز یہ کہ جب حضرت موسیٰؑ مصر سے بنی اسرائیل کو سینا لے کر آئے جس پوری مدت میں وہ غریب الوطن رہے۔ فلسطین مین ان کے پاس زمین کا کوئی ٹکڑا تک نہ رہا، جب وہ سینا میں غریب الوطن تھے تو ان کے دعوے کے مطابق اللہ نے انھیں فلسطین میں وطن دینے کا وعدہ کیوں نہیں پورا کر دیا؟[11]

- سلیمان علیہ السلام کے بعد حکومت ان کی اولاد میں تقسیم ہو گئی، ان کے درمیان جنگ رہی، تاآنکہ بابل نے ان پر چڑھائی کر کے ان کا خاتمہ کر دیا، ۵۹۸ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم سمیت پوری دولتِ یہود کو مسخر کر لیا اور یہود کا بادشاہ اس کے پاس قیدی بن کر رہا، اس کے بعد بھی وہ حضرت یرمیاہ کے سمجھانے کے باوجود اپنے اعمال سے باز نہ آئے۔ آخر کار ۵۸۷ قبل مسیح میں بخت نصر نے ایک سخت حملہ کر کے یہود کے تمام بڑے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یروشلم اور ہیکلِ سلیمانی کو پیوندِ خاک کیا۔ یہ تھا وہ پہلا فساد جس سے بنی اسرائیل کو متنبہ کیا گیا تھا۔[12]

اس پوری بحث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ فلسطین ہمیشہ سے مسلمانوں کا رہا ہے، مسلمانوں کا دورِ اقتدار سب سے زیادہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہود اس سرزمین کے کبھی اصل باشندے رہے ہی نہیں، وہ ہمیشہ اس میں غریب الوطن کی حیثیت سے رہے، پھر یہ کہ جب وہ رہے، جنگ کی حالت میں رہے، کبھی بابل نے ان پر چڑھائی کی، کبھی بخت نصر نے ان کو تہ و بالا کیا۔ لہذا مندرجہ بالا تفصیل سے یہودیوں کا یہ دعویٰ باطل ہو جاتا ہے کہ وہ تاریخی اعتبار سے اس سرزمین کے مستحق ہیں۔

فلسطین پر مسلمانوں کا شرعی حق

فلسطینیوں کے جائز حق پر یہود کا ناجائز قبضہ:

فلسطین پر شرعی یعنی قانونی حق بھی مسلمانوں کا ہی ہے، وہ مسلمانوں کا مفتوحہ علاقہ ہے، اور جو اسلام کی مفتوحہ سرزمین ہو، اس کا دفاع امت پر فرض ہے، اسرائیل غاصب ہے، اس نے اس پر زبردستی قبضہ کیا ہے، وہ کبھی بھی وہاں کے اصل باشندے نہیں رہے ہیں۔ جس کے دلائل گذشتہ عنوان کے تحت گزر چکے ہیں، قانونی طور پر کسی کے لیے بھی درست نہیں کہ کوئی کسی کی سرزمین پر زبردستی قبضہ کرے اور اسے غصب کر لے۔

ایڈورڈ سعید اپنی معرکۃ الآراء کتاب "The Question Of Palestine" میں لکھتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء سے قبل اس خطۂ زمین کے — جسے فلسطین کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ بیشتر حصہ پر عرب آباد تھے اور یہ کہ تعداد کے اعتبار سے عرب اکثریت میں تھے، قیامِ اسرائیل کے بعد ان عربوں کو یا منتشر کر دیا گیا یا وہ خود ہی اپنے گھر بار چھوڑ کر چلے گئے یا انھیں اپنے گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا یا انھیں غیر یہودی اقلیت کی حیثیت سے مملکت میں محصور کر دیا گیا۔[13]

تاریخی طور پر اس کے یقین و شواہد موجود ہیں کہ ایک سازش کے تحت اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، تمام

انصاف پسند قلم کاروں، تجزیہ نگاروں اور تمام مؤرخین کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ فلسطین اصلاً عربوں کا ہے، اسرائیل کا قیام غاصبانہ اور ناجائز ہے، یہ سب امریکہ اور برطانیہ اور ان کے غلام ممالک کی مرضی اور سازش سے ہوا۔

قیامِ اسرائیل کی گہری سازشوں پر ایک نظر

قیامِ اسرائیل، برطانوی استعمار، اتحادی ممالک اور سوویت یونین کی منظم اسکیم اور ناپاک عزائم کا نتیجہ ہے، پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴-۱۹۱۸) کے بعد جب فلسطین خلافتِ عثمانیہ کے ہاتھوں سے نکل گیا، تو ان مغربی حکومتوں نے اپنے قونصل خانوں اور سفیروں کی مدد سے فلسطین میں زمینیں خرید خرید کر یہودیوں کے حوالے کرنا شروع کر دیا۔ ترکوں کے امکانی ورثہ کی تقسیم کا ایک پلان تیار کیا گیا، اس سلسلہ میں خفیہ ملاقات و مذاکرات ہوئے، برطانیہ کی سازش اس موقع پر سب سے گہری ہے، وہ تین مختلف بلکہ متضاد راستوں اور موقفوں کے ذریعہ شام اور عراق میں اپنے اثر و نفوذ کو بحال رکھنے کے لیے کوشاں رہا، اس نے عثمانی خلافت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کے لیے امیر حجاز شریف حسین بن علی سے معاہدہ کیا، اور یہ طے پایا کہ وقتی طور پر بغاوت کا اعلان کر دیا جائے، اس معاہدہ کے مطابق شریف حسین نے ۱۰؍جون ۱۹۱۶ء کو حجاز میں بغاوت کا اعلان کر دیا اور علانیہ طور پر برطانیہ کا حلیف بن گیا، دوسری طرف مئی ۱۹۱۶ء میں سائیکس پیکو معاہدہ (Sykes Picot Agreement) ہوا، جس میں یہ طے پایا کہ عراق کا اکثر حصہ شرق اردن اور فلسطین میں حیفا کا علاقہ برطانیہ کو ملے گا۔ اور لبنان و شام فرانس کے حصے میں آئیں گے۔ فلسطین پر چونکہ متعدد یورپی سامراجوں کی نظر تھی، اس لیے اسے کسی ملک کو دینے کے بجائے یہ طے کیا گیا کہ بین الاقوامی نگرانی میں منتقل کر دیا جائے۔ برطانیہ نے چال یہ چلی کہ اس نے فلسطین کے مستقبل کے متعلق عالمی صہیونی تنظیم کے ساتھ خفیہ مذاکرات کیے۔ پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ اور سلطنت عثمانیہ کے سقوط کے بعد برطانوی فوجیں عرب فوجوں کے تعاون سے ۱۱؍ستمبر ۱۹۱۷ء کو شہر قدس میں داخل ہو گئیں۔ ستمبر ۱۹۱۸ میں برطانوی فوجیں شمالی فلسطین پر قابض ہو گئیں اور اکتوبر ۱۹۱۸ تک انھوں نے شرقِ اردن، شام اور لبنان پر بھی قبضہ کر لیا، اس وقت سے برطانیہ نے منظم طور پر عملاً سرزمینِ فلسطین کو یہودیوں کو حوالے کرنا شروع کر دیا۔ ۱۰؍جنوری ۱۹۲۰ء کو برطانیہ کے طاقت ور حلیفوں کے اتفاقِ رائے سے فلسطین کو برطانوی مینڈیٹ میں دے دیا گیا، اور پھر ستمبر ۱۹۲۲ میں اقوامِ متحدہ نے بھی اس فیصلہ کی توثیق کر دی، وعدۂ بالفور (Balfour Declaration) کو پورا کرنے کے لیے برطانیہ نے یہودی مہاجرین کی پوری طرح امداد کی جس کے نتیجے میں یہودیوں کی تعداد جو کہ ۱۹۱۵ میں ۸؍فیصد یعنی ۵۵؍ہزار تھی وہ ۱۹۴۸ تک ۳۱؍فیصد یعنی چھ سو پچاس ہزار ہو گئی، فلسطین کے انقلابِ عظیم (۱۹۳۶-۱۹۳۹) کے بعد برطانیہ کی قائم کی ہوئی پیل کمیشن نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد فلسطین کو یہودی اور عربی دو ریاستوں میں تقسیم کرنے اور شہرِ قدس اور حیفا کو برطانوی مینڈیٹ کے تحت قائم رکھنے کی سفارش کی، لیکن یہودیوں اور عربوں دونوں نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ۳۱؍اگست ۱۹۴۵ء میں امریکی صدر ٹرومین نے برطانیہ کے وزیرِ اعلیٰ اٹلی (Attlee) سے مطالبہ کیا کہ ایک لاکھ یہودی فلسطین بھیجے جائیں، اینگلو امریکن کمیٹی نے ۱۹۴۶ء میں فلسطینی اراضی کی منتقلی اور یہودیوں کے ساتھ ان کو

فروخت کرنے کی آزادی دے کر ایک لاکھ یہودیوں کی فلسطین میں آباد کاری کی سفارش کی،(۱۹۳۹-۱۹۴۵) میں بانوے ہزار یہودیوں نے فلسطین ہجرت کی،اس کے بعد (۱۹۴۵-۱۹۴۸) میں اکسٹھ (۶۱) ہزار یہودی مختلف ملکوں سے ہجرت کر کے فلسطین میں بس گئے اور ۲۰۷ہزار ایکڑ زمین حاصل کرلی اور ۳۷۷ نئی کالونیاں بنا لیں، بالآخر ۲۹ نومبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اپنی تاریک ترین قرار داد نمبر ۱۸۱ بھی جاری کر دی۔ یوں برطانیہ کی ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اقوام متحدہ کے ذریعہ ''برطانوی انتداب'' کو ختم کر کے اسرائیلی خنجر عربوں کے قلب فلسطین میں پیوست کر دیا گیا، جو کہ غاصبانہ اور ناجائز تھا۔[۱۴] ۱۹۴۸ء کی جنگ کے بارے میں ایک انگریزی مؤرخ لکھتا ہے کہ ۱۹۴۸ کی جنگ دھوکہ ہی دھوکہ تھی، حکمرانوں نے دھوکہ دیا، فوجوں نے دھوکہ دیا، جنرلوں نے دھوکہ دیا؛ کیوں کہ جو جنرل تھے وہ یا تو برطانیہ کے تھے یا فرانس کے تھے یا یورپ کے مشیر تھے،ان کو لڑنے سے مجبور کر دیا گیا۔ کتاب میں اس نے لکھا ہے کہ عرب تعداد میں زیادہ تھے؛ لیکن وہ شکست کھا گئے۔Because there were not united یہ الفاظ اس نے لکھے ہیں۔ حیرت ہے کہ ایک غیر مسلم نے یہ الفاظ لکھے ہیں۔(وہ متحد نہیں تھے) وہ خائن تھے اور اسی بنیاد پر سارے انقلاب ہوئے۔[۱۵] محترم پال فنڈلے اپنی کتاب Deliberate Deceptions میں لکھتے ہیں: ''بقول ایک فلسطینی دانش ور عیسیٰ نخلہ کے'' یہودی اقلیت کو ایک ایسے علاقے میں اپنی آزاد ریاست کے قیام کا اعلان کرنے کا کوئی حق نہیں تھا، جہاں فلسطینی عرب قوم آباد تھی۔[۱۶] خود 'Civil and political rights' کی منشور کی دفعہ ۱۷ میں کہا گیا تھا: ''کسی بھی شخص کو من مانی طور سے اس کی املاک سے محروم نہیں کیا جائے گا۔[۱۷]

خاتمہ

اس پوری بحث، دلائل و شواہد اور قرآن کے فیصلہ کن موقف سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ فلسطین ہمیشہ سے مسلمانوں کا رہا ہے۔ مسلمانوں کا دینی، جغرافیائی، ثقافتی، تاریخی، قانونی بہر اعتبار اس سے تعلق وابستہ ہے۔ یہود جب بھی اس کے مالک رہے، غاصبانہ طور پر رہے، کسی کی زمین اس کے حق دار سے چھین کر اپنا حق بتانا اور بالجبر اس پر اپنی ریاست قائم کر کے اصل باشندوں کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟ ہاں امت کا اس سے تغافل برتنا بالکل درست نہیں ہے، بلکہ اسلام کی منشا کے خلاف ہے، یہ مسئلہ امت کے ہر فرد کا ہے۔ علامہ قرضاوی لکھتے ہیں: ''اسلام مسلمانوں کو یہ جواز فراہم نہیں کرتا کہ وہ دار الاسلام کی ایک بالشت زمین سے بھی تغافل برتیں، جس کو کفار ان سے غصب کر لیں، یہ اسلام کا خاص و عام ہر ایک کے لیے طے شدہ معاملہ ہے، جس پر تمام علمائے امت کا اجماعِ قطعی ہے۔[۱۸] ڈاکٹر محمد طارق ایوبی فرماتے ہیں: ''مسئلۂ فلسطین خالص اسلامی مسئلہ ہے اور تمام مسلمانانِ عالم کا مسئلہ ہے، جیسے حرم مکی اور حرم مدنی کو صرف سعودی عرب کا مسئلہ نہیں کہا جا سکتا ویسے ہی فلسطین کے مسئلہ کو فلسطینیوں یا عربوں کا مسئلہ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا، اگر فلسطینی اس سے تنازل اختیار کریں تو امت پر ان کی نکیر اور ان سے مقابلہ لازم ہوگا، کیوں کہ القدس امت کی امانت ہے اور امت پر اس کا دفاع فرض ہے۔''[۱۹] (بقیہ ملاحظہ کیجیے! ص: ۶۲ پر)

معاشیات

اسلامی تصورِ معاش کے فیوض و برکات

محمد انس فلاحی مدنی
رفیق ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت، نفسیات اور جبلّی عادتوں کے پیشِ نظر ایسا نظامِ معیشت فراہم کیا ہے، جس میں سارے انسانوں کی فلاح مضمر ہے۔ انسان کو رزق کمانے کی ترغیب، صَرف مال اور مصارفِ مال کے سلسلے میں جامع ہدایات دی ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کسی انسان کی وجہ سے دوسرے کو کوئی ضرر نہ پہنچے، اس کے حقوق سلب نہ ہوں۔ وہ کسی کی زیادتی کا شکار نہ ہوں۔ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے۔ اسی کے ساتھ ہر مومن پر اس کے مال سے کچھ لوگوں کے حقوق متعلق کیے ہیں۔ ان کی ادائیگی پر اجر و ثواب اور کوتاہی پر مواخذہ کی وعید سنائی گئی ہے۔

اسلامی نظامِ معیشت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مال کے سلسلے میں حلال و حرام کے حدود و آداب نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ انسان پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ کون سا ذریعہ معاش اختیار کرے۔ کھیتی باڑی کرے، باغبانی کرے یا دنیا میں مروجہ ذرائع معاش سے وابستہ ہو جائے یا پھر کسی صنعت کو کسبِ معاش کے لیے اختیار کرے۔ بس اس کے لیے لازمی یہ ہے کہ حلال و حرام کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھے۔ اسلامی نظامِ معیشت کی چند بنیادی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

مال اللہ کا عطیہ ہے

مال و دولت کے تعلق سے اسلام نے مومن کو یہ ہدایت دی ہے کہ یہ مال اللہ کا عطیہ ہے۔ اس میں تمھیں تصرف کا پورا اختیار دیا گیا ہے۔ اس کے لیے حدود و آداب مقرر کیے گئے ہیں۔ تمھارے مال میں اللہ نے دوسروں کے حقوق بھی متعین کیے ہیں۔ تم اپنا مال جس طرح خرچ کرو گے، سب پر اس کی نگرانی ہے۔ اسی کے مطابق تمھیں جزا یا سزا ملے گی۔ اللہ نے جو کچھ حقوق تمھارے مال میں متعین کیے ہیں، اس سے تمھارا مال کم نہیں ہوگا، بلکہ مال پاک ہوگا اور بڑھے گا۔ ارشاد باری ہے: مَن ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً فَيُضَاعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيْمٌ (سورۃ الحدید: ۱۱)، "کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض، تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے، اور اس کے لیے بہترین اجر ہے۔" ایک جگہ فرمایا گیا: وَمَا تُقَدِّمُوْا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيْرٌ (سورۃ البقرۃ: ۱۱۰)، "تم اپنی عاقبت کے لیے جو بھلائی کما کر بھیجو گے، اللہ کے ہاں اسے موجود پاؤ گے۔ جو کچھ تم کرتے ہو، وہ سب اللہ کی نظر میں ہے۔"

اخلاقی اقدار

اسلام اپنے ماننے والوں کے نفس کی تربیت کرتا ہے۔ اُنھیں اخلاقی اقدار کا حامل بناتا ہے۔ قرآن مجید انسانوں کی اجتماعی، عائلی اور اقتصادی معاملات کے انتظامی اور دنیاوی پہلوؤں کے بالمقابل ان کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دی ہے۔

مؤمن انسانوں کے لیے نفع بخش ہو۔ نفع رسانی کا جذبہ اس کے اندر پروان چڑھتا رہے۔ اس کے لیے تزکیہ نفس انبیاء کا بنیادی مشن رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے مقصد بعثت کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (سورۃ الجمعۃ: ۲)۔

''وہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول ﷺ خود اُنہی میں سے اُٹھایا، جو انھیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔''

مؤمن دوسرے کا خیر خواہ ہو۔ وہ اپنے بھائی کی تکلیف دیکھ کر بے چین ہو جائے۔ یہی جذبہ اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ دینِ اسلام سراسر خیر خواہی کا نام ہے۔ حضرت تمیم داریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

الدِّينُ النَّصِيحَةُ قُلْنَا: لِمَنْ؟ قَالَ: لِلَّهِ وَلِكِتَابِهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ (۱)۔

''دین خیر خواہی کا نام ہے۔ پوچھا کہ یہ نصیحت اور خیر خواہی کس کے حق میں کرنی چاہیے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ کے لیے، اللہ کی کتاب کے لیے، اللہ کے رسول کے لیے، مسلمانوں کے ائمہ کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے۔''

نصیحت ایسا جامع لفظ ہے جو سچائی، خلوص، خیر خواہی اور سب بھلائیوں پر محیط ہے۔ اللہ کے ساتھ خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس پر صحیح طور پر ایمان رکھا جائے اور اس کی عبادت اخلاص سے کی جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے، اس کے احکام کی پیروی کی جائے اور مناہی سے اجتناب کیا جائے۔

رسول کی خیر خواہی یہ ہے کہ رسالت کی تصدیق، ان کے حکم و فرمان کی اطاعت، سنّت کی پیروی اور بدعت سے پرہیز کیا جائے۔

کتاب اللہ کی خیر خواہی: اس کی تصدیق، تلاوت کا التزام، تحریف و تبدیل لفظی و معنوی ہر قسم سے اجتناب اور اس کے احکام پر عمل و تنفیذ کرنا ہے۔

مسلمان حکمرانوں کی خیر خواہی کا مطلب ہے کہ حق بات میں ان کی اعانت، غیر معصیت میں ان کی اطاعت ہو، اگر وہ سیدھے راستے سے انحراف کریں تو انہیں معروف کا حکم دیا جائے اور ان کے خلاف بغاوت و خروج سے گریز کیا جائے الّا یہ کہ ان سے کفرِ صریح کا ارتکاب واظہار ہو۔

عام مسلمانوں کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی دنیا و آخرت کی اصلاح کے لیے ان کی صحیح رہنمائی کی جائے، انھیں نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے، اور ان سے محبت رکھے، ان کی ایذا رسانی سے بچے۔ (۲)

اس جذبہ کی آبیاری کے لیے رسول اللہ ﷺ نے متعدد مواقع پر صحابہ کرامؓ کی تربیت کی۔ مومن دوسرے کی تکلیف کو محسوس کرے، اسے تنگی سے نکالنے کی کوشش کرے۔ اس کے لیے ممکنہ سہولت فراہم کرے۔ حضرت ابو ہریرۃؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا، نَفَّسَ اللهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ، يَسَّرَ اللهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا، سَتَرَهُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَاللهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ(۳)

''جس شخص نے کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کی، اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا اور جس شخص نے کسی تنگ دست کے لیے آسانی کی، اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں آسانی کرے گا اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد میں لگا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔''

مؤمن اپنے بھائی کو تنگ دستی اور فقر وفاقہ کی حالت میں دیکھے تو اس کا دل بے چین ہو جائے، اس کی پریشانی کو دور کرنے کے لیے تڑپ اٹھے۔ یہی ان احادیث کا تقاضا ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (م۱۹۷۹ء) اسلام کے نظامِ معیشت پر اخلاقی پہلو کی قوتِ اثر کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''اسلام انسان کے اخلاقی نشو ونما کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اور اس مقصد کے لیے یہ ضروری ہے کہ معاشرے کے اجتماعی نظام میں فرد کو اختیاری حسنِ عمل کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل رہیں تاکہ انسانی زندگی میں فیاضی، ہمدردی، احسان اور دوسرے اخلاقی فضائل روبہ عمل آسکیں۔ اسی بنا پر معاشی انصاف قائم کرنے کے لیے اسلام صرف قانون پر انحصار نہیں کرتا بلکہ اس معاملہ میں وہ سب سے بڑھ کر جس چیز کو اہمیت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ایمان، عبادات، تعلیم اور اخلاقی تربیت کے ذریعہ سے انسان کی داخلی اصلاح کی جائے، اس کے ذوق کو بدلا جائے، اس کے سوچنے کے انداز کو تبدیل کیا جائے اور اس کے اندر ایک مضبوط اخلاقی حس (Moral Sence) پیدا کی جائے جس سے وہ خود انصاف پر قائم رہے۔''(۴)

تقسیمِ دولت

اسلامی نظامِ معیشت کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مومن کو احتکار سے منع کیا گیا ہے۔ مومن مال جمع کر کے سینت سینت کر نہ رکھے، بلکہ اسے اپنی ضروریات اور دیگر حقوق کی ادائیگی میں صرف کرے۔ زکوۃ، صدقات اور انفاق کے حکم کی یہی منشاء ہے کہ دولت گردش میں رہے، ایک جگہ سمٹ کر نہ رہ جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ (سورۃ الحشر: ۷)

''جو کچھ بھی اللہ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسولؐ کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسولؐ اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ وہ تمھارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔''

ایک جگہ جمع شدہ مال راہِ خدا میں خرچ نہ کرنے پر یہ وعید سنائی گئی ہے، ارشادِ باری ہے:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلاَ يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ۔ يَوْمَ يُحْمَى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَذَا مَا كَنَزْتُمْ لأَنفُسِكُمْ فَذُوقُواْ مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ۔ (سورۃ التوبۃ: ۳۴-۳۵)

"دردناک سزا کی خوش خبری دو اُن کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔"

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أَنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ [۵] "ان پر اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ دینا فرض قرار دیا ہے، یہ ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے غریبوں پر خرچ کی جائے گی۔"

مولانا ابوالکلام آزادؒ (م ۱۹۵۸ء) اسلام کے نظامِ معیشت کی خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"قرآن وسنت کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کی عملی زندگی کے مطالعے کے بعد مجھے اس حقیقت کا پورا اذعان ہو گیا ہے کہ اسلام کے بنائے ہوئے اجتماعی نقشہ میں دولت اور وسائلِ دولت کے احتکار اور اکتناز کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلام نے سوسائٹی کی نوعیت کا جو نقشہ بنایا ہے اگر ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے اور صرف چند خانے ہی نہیں؛ بلکہ تمام خانے اپنی اپنی جگہ بنیں، تو ایک ایسا اجتماعی نظام پیدا ہو جائے گا جس میں نہ تو بڑے بڑے کروڑ پتی ہوں گے نہ مفلس محتاج طبقے۔ ایک طرح کی درمیانی حالت غالب افراد پر طاری ہو جائے گی۔ بلاشبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے، کیوں کہ سعی وکسب کے بغیر کوئی مومن زندہ ہی نہیں رہ سکتا، لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور بھی ہوگا اور اس لیے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی اتنی ہی زیادہ جماعت بحیثیت جماعت کے خوش حال ہوتی جائے گی۔"[۶]

موجودہ دور میں مالیات کا سودی نظام اور تقسیم دولت کے لیے سود کا پیمانہ نیز منافع کے یقین کے لیے سود ہی احتکار اور اکتناز دولت و آمدنی کی بنیادی وجہ ہے۔ اسی چیز سے بچنے کے لیے اسلام نے سود کو حرام کیا ہے، تاکہ کسی عامل کے پاس بغیر محنت کے دولت جمع نہ ہو سکے اور پیداوار و آمدنی مساوی اور عادلانہ طریقے سے تقسیم ہو سکے۔ موجودہ دور میں پوری دنیا کے اندر مال و دولت کی کثرت کے ساتھ اس کا چند مخصوص ہاتھوں میں ارتکاز واحتکار بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے اور اس کی صرف ایک وجہ ہے کہ سود سے ساری دولت بغیر کسی محنت اور کاروباری شرکت کے چند مخصوص گروہوں کے پاس جمع ہوتی رہتی ہے، جو انسانی حقوق کی پامالی کا بھی ذریعہ ہے اور دولت کے ناجائز احتکار کی وجہ بھی ہے۔

حقوق کی ادائیگی

اسلامی نظامِ معیشت کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک انسان کی دوسرے سے ہمدردی وابستہ رکھنے اور

ہمدردی واپنائیت کے اس رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے ایک دوسرے پر کچھ مالی حقوق عائد کیے گئے ہیں۔اس کا منشاء یہ ہے کہ انسان کو اپنے مال کے بارے میں یہ تصور قائم نہ ہو کہ یہ سب کچھ میرا ہی ہے۔ میں ہی اس کی کل ملکیت کا مالک ہوں۔ مجھ پر کسی کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ تصور ہی انسان کو معاشرے سے کاٹتا ہے اور دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنے میں حائل ہوتا ہے۔

مالی حقوق کی ادائیگی انسان کو ہم درد، غم خوار اور ملنسار بناتی ہے۔اس سے قلبی سکون اور لذتِ ایمانی کی حلاوت و سرور کا احساس ہوتا ہے۔ یہ چیز معاشرے میں تعاونِ باہمی کی فضا کو مضبوط کرتی ہے اور اخوت وبھائی چارگی کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتا ہے۔

معاش: وسائلِ زندگی

اسلامی نظامِ معیشت میں یہ تصور بہت خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے کہ معاش انسانی زندگی کی ضرورت ہے۔ اس کے حصول، جد وجہد، کسب کے تمام مواقع صرف اس ضرورت کے تحت مہیا کیے گئے ہیں کہ انسان اس دنیا میں خوش حال زندگی گزارے۔ وہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے۔ معاشرے میں خوش حالی ہو۔ یہ وسائل معاش زندگی گزارنے کے لیے ہیں، اسی حد تک ان کے لیے دوڑ دھوپ ہو۔ معاشی فکر مقصدِ حیات نہیں ہے۔انسان کو اس دنیا میں اچھی غذا، خوش لباسی اور مناسب طرزِ رہائش کے لیے جتنے وسائل کی ضرورت ہو ان کے لیے ضروری تگ ودو کرے۔ یہ چیزیں اس کا مقصد نہ بن جائیں اور وہ مقصدِ زندگی سے غافل ہو جائے۔

رزق اور تقدیر

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے رزق کے مواقع سب کے لیے یکساں فراہم کیے ہیں۔ نباتات، جمادات اور حیوانات سب کے لیے مسخر کیے گئے ہیں۔ لیکن بعض افراد مالی طور سے خوش حال ہوتے اور بعض رزق کی تنگی کا سامنا کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے ؟ یہ اہم سوال ہے۔ کیا ایسا اللہ نے تقدیر میں لکھا ہے ؟ بعض انسان حتی الامکان جد وجہد کرنے کے باجود رزق کی تنگی کا شکار رہتے ہیں اور بعض کے لیے معمولی جد وجہد بھی رزق کی فراوانی کا ذریعہ بنتی ہے۔ایسا اللہ نے اپنی مشیئت اور حکمت کے پیشِ نظر کیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلَٰكِن يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ بِعِبَادِهٖ خَبِيرٌ بَصِيرٌ (سورۃ الشوریٰ: ۲۷) ”اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے، مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے نازل کرتا ہے یقیناوہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان پر نگاہ رکھتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں امام بغویؒ (م ۵۱۰ھ) لکھتے ہیں :

”حضرت خباب بن ارتؓ نے کہا کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع کے حالات کا مشاہدہ کیا۔ تو ہم بھی اس کی آرزو اور خواہش کرنے لگے تب اللہ

تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(۷)

علامہ قاضی ثناءاللہ پانی پتی (م ۱۸۱۰ء) اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''اگر اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کے لیے رزق کشادہ کر دیتا تو وہ تکبر اور سرکشی کرنے لگتے اور زمین میں فساد برپا کر دیتے۔ 'لبغوا' کا معنی یہ ہے کہ ان میں سے بعض بعض پر غلبہ پانے اور ایک دوسرے سے اونچا ہونے کی کوشش کرتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے 'بغیهم' کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ ان کا ایک درجے کے بعد دوسرے درجہ کی، ایک سواری کے بعد دوسری سواری کی اور ایک لباس کے بعد دوسرے لباس کی طلب اور خواہش کرنا۔ 'بغی' کا اصل معنی یہ ہے کہ ہر وہ شئ جو کمیت (مقدار) اور کیفیت (حالت) کے اعتبار سے تقسیم کو قبول کرتی ہے اس کے حصول اور اس کی خواہش کرنے میں راہِ اعتدال سے تجاوز کر جانا۔ اللہ تعالیٰ ایک خاص اندازے سے جس کا تقاضا اس کی حکمت کرتی ہے۔ ان کے لیے رزق اتارتا ہے۔(۸)

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (الانعام: ۱۶۵)

''وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے ،تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں آزمائش کرے۔ بے شک تمھارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت در گزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔''

ایک جگہ اللہ نے یہی بات ان الفاظ میں کہی ہے، ارشاد باری ہے:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضاً سُخْرِيّاً وَرَحْمَةُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (سورۃ الزخرف: ۳۲)

''دنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں' اور ان میں سے کچھ لوگوں کو دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں اور تیرے رب کی رحمت (نبوت) اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو (ان کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں۔''

ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

لوگوں کے درمیان رزق میں تفاوت اللہ کی بڑی حکمت کا تقاضا ہے۔ اگر سارے انسان مزدور ہو جاتے تو روزگار کسے ملتا اور اگر سارے لوگ مالک ہو جاتے تو مزدوری کون کرتا؟ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی دوسرے انسان سے ضروریات وابستہ رکھی ہیں۔ ہر ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ مریض ڈاکٹر کا محتاج اور ڈاکٹر اپنے کاموں کے لیے مزدوروں کا محتاج ہے۔ یعنی ہر ایک کی کسی نہ کسی سے ضروریات جڑی ہوئی ہیں۔ سید قطب شہیدؒ (۱۹۶۶ء) اس آیت کی نہایت عمدہ تشریح کرتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں اب وقت آگیا ہے کہ اہل اسلام، اسلام کے بارے میں بالکل کھل کر اور صاف صاف باتیں کریں۔ وہ ان خود ساختہ نظریات سے متاثر ہوئے بغیر اور دفاعی انداز اختیار کیے بغیر صاف صاف کہہ دیں کہ رزق میں فرق مراتب ایک حقیقت ہے جسے اسلام روا رکھتا ہے اور لوگ ہمیشہ وسائل رزق کے معاملے میں مختلف ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی طبیعی اور حالت نفسی اسی تفاوت پر قائم ہے۔ لوگوں کو خالق کائنات کی طرف سے مختلف درجوں کی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔

ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق کام کر سکتا ہے اور یہ تفاوت اور فرق مراتب اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہر شخص نے اس کرۂ ارض پر فریضۂ خلافت الٰہیہ کی ادائیگی میں بالکل ایک جدا کردار ادا کرنا ہے۔ اگر سب لوگ اس طرح پیدا کیے گئے ہوتے جس طرح پریس سے ایک اشتہار چھپتا ہے یا کتاب کا ایک نسخہ تیار ہوتا ہے تو اس دنیا میں زندگی کی یہ اجتماعی صورت نہ ہوتی اور کئی ضروری کام یونہی رہ جاتے جن کے سرانجام دینے کے لیے کوئی قابل آدمی نہ ہوتا کیوں کہ ان کے لیے کوئی قابل آدمی ہی نہ ملتا۔''(۹)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ (م۱۹۹۷ء) اس آیت کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

''اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ذہنی اور مادی دونوں ہی اعتبار سے درجات و مراتب کا تفاوت کیوں رکھا ہے؟ فرمایا کہ ایسا اس نے اس وجہ سے کیا ہے کہ لوگ باہم دگر تعاون کی زندگی بسر کریں اور ایک دوسرے کو اپنے کام میں لگا سکیں۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے بنائی ہے اس وجہ سے اس کا نظام اس نے اس طرح رکھا ہے کہ اس میں ہر شخص دوسروں کا محتاج بھی ہے اور محتاج الیہ بھی۔ بڑے سے بڑا بادشاہ بھی دوسروں کا محتاج ہے اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی اس میں محتاج الیہ ہے۔ یہاں کوئی شخص بھی دوسرے سے مستغنی نہیں اور کوئی شخص بھی ایسا نہیں کہ معاشرہ میں کسی نہ کسی پہلو سے اس کی افادیت نہ ہو۔''(۱۰)

اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کا رزق اپنے ذمہ رکھا ہے۔ اس کائنات میں ایک اندازے کے مطابق بیس لاکھ مخلوق ہیں۔ بعض زمین، بعض زیرِ زمین اور بعض آسمان میں رہتی ہیں۔ اللہ نے سب کے رزق کا نظام بنایا۔ چرند، پرند کو ایک دوسرے کی غذا بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جملہ مخلوقات میں انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے، جس کے لیے دنیا کی ہر چیز مسخر کر دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں رزق کا وعدہ متعدد جگہ پر آیا ہے، ذیل میں چند آیات ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ (سورۃ ھود: ۶) ''زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے، اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے، سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے۔''

ایک جگہ فرمایا گیا:

وَكَأَيِّن مِن دَآبَّةٍ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (سورۃ العنکبوت: ۶۰)

''کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے، اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمھارا رازق بھی وہی ہے وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔''

ایک جگہ مفلسی کی وجہ سے قتل اولاد سے روکتے ہوئے رزق کے وعدہ کی یاد دہانی کرائی ہے۔ فرمایا گیا:

وَلاَ تَقْتُلُواْ أَوْلادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُم (سورہ بنی اسرائیل: ۳۱)

''اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی۔''

اللہ جسے چاہتا ہے بے پناہ رزق سے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے کم رزق عطا کرتا ہے۔ یہ اس کی منشاء اور حکمت پر منحصر ہے۔ قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کشادگی رزق کے لیے بسط اور تنگیٔ رزق کے لیے قدر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ الفاظ دس مقامات پر آئے ہیں۔ ذیل میں چند ملاحظہ فرمائیں:

اللهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقَدِرُ وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الآخِرَةِ إِلاَّ مَتَاع۔ (الرعد: ۲۶)۔ ''اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا رزق دیتا ہے۔ یہ لوگ دنیوی زندگی میں مگن ہیں، حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاعِ قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا (بنی اسرائیل: ۳۰)

''تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انھیں دیکھ رہا ہے۔''

وَيْكَأَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ (سورۃ القصص: ۸۲)

''اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے۔''

ایک حدیث میں اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ کوئی انسان اس وقت تک نہیں مرے گا، جب تک وہ اپنے حصے کی پوری روزی حاصل نہ کرلے۔ حضرت ابوامامہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ رَوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رُوعِي أَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَكْمِلَ أَجَلَهَا وَتَسْتَوْعِبَ رِزْقَهَا فَأَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّ أَحَدَكُمُ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ أَنْ يَطْلُبَهُ بِمَعْصِيَةٍ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُنَالُ مَا عِنْدَهُ إِلَّا بِطَاعَتِهِ[11]

''جبرئیلؑ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ کسی آدمی کو اس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک وہ اپنے حصے کا رزق حاصل نہ کرلے۔ پس تم تقویٰ اختیار کرو اور طلب رزق میں میانہ روی سے کام لو اور کمی کی صورت میں معصیت کے راستے اختیار نہ کرو کیوں کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تم اس کی اطاعت اور خوشنودی سے ہی حاصل کر سکتے ہو۔''

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ (م ۱۹۵۶ء) نے اپنی کتاب 'اسلامی معاشیات' میں بسط و قدر کے عنوان سے اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی آمدنی جو بالکل خرچ کے برابر برابر، ایک دم بالکلیہ اس کے مطابق ہو، اس کا نام رزق مقدور ہے۔ یعنی ضرورت کے مطابق نپی تلی روزی۔ بعضوں کی آمدنی کا پیمانہ ایسا ہوتا ہے کہ ضروریات میں خرچ

کرنے کے بعد بھی ان کے پاس بچ جاتا ہے۔ رزق کے اسی پیمانے کا نام بسطی پیمانہ ہے۔ (۱۲)

ان کی پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کشادہ رزق رکھنے والے شکر کریں، اپنی مفوضہ ذمہ داریاں ادا کریں اور ان پر جو مالی حقوق عائد ہوتے ہیں ان کی ادائیگی کریں۔ جو لوگ معاشی تنگی کا شکار ہیں، وہ صبر کریں حتی المقدور کسبِ معاش کی جدوجہد کریں۔

خلاصہ یہ ہے اسلامی نظامِ معاش فرد کو مال کمانے اور خرچ کرنے کے سلسلے میں میانہ روی کی تعلیم کے ساتھ مال کو دوسروں انسانوں کے لیے بھی نفع بخش بنانے کے لیے زکوۃ وصدقات کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے۔

حوالہ جات:

۱- صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان أن الدین النصیحۃ، حدیث: ۹۵

۲- حافظ صلاح الدین، دلیل الطالبین ترجمہ و فوائد ریاض الصالحین، دار السلام، ریاض، سعودی عرب، ۱۹۹۷، ص: ۱۹۸

۳- مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن وعلی الذکر، حدیث: ۳۸

۴- سید ابوالاعلیٰ مودودی، معاشیاتِ اسلام، مرتبہ پروفیسر خورشید احمد، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص: ۱۴۶

۵- صحیح البخاری، کتاب الزکوۃ، باب اخذ الصدقۃ من الأغنیاء وترد فی الفقراء حیث کانوا، حدیث: ۱۴۹۶

۶- ابوالکلام آزاد، حقیقت زکوۃ، دار السلام، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۳۳

۷- امام بغوی، معالم التنزیل فی تفسیر القرآن، دار طیبہ، ۱۹۹۷ء ج ۷، ص: ۱۹۴

۸- قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ترجمہ، پیر کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ج۸، ص: ۷ ۲ ۴

۹- سید قطب، فی ظلال القرآن، دار الشروق، بیروت، ۱۹۸۸ء، ج۵ ص: ۳۱۸۷

۱۰- امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، پاکستان، ۲۰۰۹ء، ج۷، ص: ۲۲۶

۱۱- حلیۃ الأولیاء وطبقات الاصفیاء، ابو نعیم احمد بن عبد اللہ بن احمد بن اسحاق بن موسی بن مہران الاصبہانی، السعادۃ - بجوار محافظۃ مصر، ۱۹۷۴ء، ج: ۱۰، ص: ۲۶

☆☆☆

انٹرویو

ملک وملت کی موجودہ صورت حال کو سوال جواب کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش

ابو فہد ندوی، نئی دہلی

معروف دانشور اور عالم دین جناب محمد لقمان ندوی صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، وہ ایک عرصے سے تعلیمی، سماجی اور سیاسی میدان میں سر گرم عمل ہیں۔ ان کا تعلق مہاراشٹر سے ہے، انہوں نے ملک کی معروف دینی درسگاہ ندوۃ العلماء سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے سیاسیات میں گریجویشن کیا ہے۔ سیاسی طور پر ملک کی معروف اکلوتی مسلم سیاسی پارٹی سے گزشتہ دس سالوں سے عملی طور پر وابستہ ہیں۔ ان کی صلاحیت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے پارٹی نے انہیں ممبئی میں اپنا ترجمان منتخب کیا ہے۔ ملک کے معروف مختلف چینلز پر عموماً ہونے والی ڈبیٹس میں پارٹی اور مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے آپ نے انہیں دیکھا اور سنا ہوگا۔

میں نے ایک طالب علم کے طور پر موصوف کے علم وفہم، سیاسی سوجھ بوجھ اور تجربات سے استفادہ کرنے کی غرض سے اور اپنے جیسے طالب علموں کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے موصوف سے ملک وملت کی موجودہ صورت کے حوالے سے دس سوالات پر ان کے جواب لینے اور ان سوال جواب کی روشنی میں ان کی فکر وفہم سے روشنی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ آپ تمام حضرات موصوف کے جوابات سے مستفید ہوں گے۔ ابو فہد ندوی، نئی دہلی

سوال ۱: ۲۰۲۴ء کے لوک سبھا انتخابات ۲۰۱۴ء اور ۲۰۱۹ء کے مقابلے میں کس نوعیت سے مختلف ہیں۔ اور مسلم اقلیت کے نقطۂ نظر سے یہ نتائج کس حد تک امید افزا ہیں؟

جواب ۱: ۲۰۲۴ء کے انتخابات میں اپوزیشن پارٹیاں کرو یا مرو جیسی تشویشناک حالت میں تھیں۔ دراصل یہ انتخابات عوام اور الیکشن کمیشن کے درمیان ہوئے اور عوام کی طاقت کے سامنے بدعنوان الیکشن کمیشن تھوڑا بہت کمزور پڑتا ہوا بھی دکھائی دیا۔ اس الیکشن میں دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ جنرل الیکشن صرف دو طرفہ یعنی انڈیا بنام این ڈی اے لڑا گیا، ایک طرف صرف نفرت، دہشت، مسلمان اور پاکستان پر مبنی بیانیہ تھا تو دوسری طرف مختلف عوامی ایشوز تھے۔ بعض پارٹیوں نے دونوں انڈیا و این ڈی اے کو نشانہ بنایا۔ اور یہ سیاسی طور پر ضروری بھی ہے۔

۲۰۱۴ء میں انّا ہزارے کی کرپشن مخالف مہم نے عوام میں من موہن حکومت کے خلاف اُبال پیدا کر دیا تھا چونکہ انّا ہزارے کو دائیں بازو نے پوری طرح فنڈنگ کی اور بڑے بڑے احتجاجی دھرنے ریلیاں اور بھوک ہڑتال کے ایونٹس کو زبردست عوامی بیداری کے ساتھ آرگنائز کیا، انّا کے ساتھ کام کرنے والے ہر طبقے، مذہب اور عمر کے لوگ تھے (میں خود بھی انڈیا اگینسٹ کرپشن کا حصہ تھا، بعد میں عام آدمی پارٹی میں بھی شامل ہوا۔ ڈیڑھ سال بعد جب ہم نے یہ دیکھا

کہ اس میں ۹۹ فیصد آر ایس ایس کے ہی لوگ ہیں تو ہمارے ساتھ بڑی تعداد نے ماس استعفی دیا) بھاجپا نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھایا اور عوام کو نئے بھارت کا خواب دکھا کر، ملازمتوں اور پندرہ لاکھ کا لالچ دے کر پروپیگنڈہ الیکشن جیت لیا۔

۲۰۱۹ء آتے آتے ملک میں مسلمانوں کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور آر ایس ایس نے پوری طرح ساتھ دیتے ہوئے عوام سے مزید پانچ سال مانگ لیے، اسلاموفوبیا اور خوف کی سیاست نے ملک پر قبضہ کر لیا اور جمہوری یا کہیے عوامی ادارے دفن کر دیے گئے، صرف چار لوگوں کی حکومت بنی، دو بیچنے والے دو خریدنے والے، اپوزیشن کے خلاف سرکاری کریک ڈاؤن نے اپوزیشن کو متحد کر دیا اور یہ سب اپوزیشن رہنما اپنا اور اپنی پارٹیوں کا وجود بچانے کے لیے میدان میں نکل پڑے، کیونکہ ان کے سامنے بس ایک کرو یا مرو والی پوزیشن بچی رہ گئی تھی۔

جہاں تک مسلمانوں کی بات ہے تو ۲۰۲۴ء کے انتخابات کے بعد ان کو تھوڑا سانس لینے کا موقع ضرور ملا ہے؛ تاہم زیادہ توقعات نہیں رکھنی چاہیے، پالیسیاں جو ہیں اور جو بنتی ہیں وہ اکثر مسلم مخالف ہی ہیں حکومت کسی کی بھی ہو۔

سوال ۲: ۲۰۲۴ء کے لوک سبھا انتخابات کے نتائج ملک میں سیاسی ماحول کا رخ کس طرح تبدیل کریں گے اور خاص کر ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں پر ان نتائج کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

جواب ۲: ۲۰۲۴ء کے لوک سبھا انتخابات کے بعد ملک کا سیاسی ماحول پوری طرح بدل چکا ہے۔ اب رنگا وبلا میں وہ دم خم نہیں ہے، جو ملک کو ویناش کی طرف لے گیا تھا۔ اور جو آوازیں گلے میں دفن ہو جایا کرتی تھیں وہ کانوں تک پہنچنے لگی ہیں، آنے والے دن ان شاءاللہ دستوری جمہوریت کی بحالی کے دن ہیں، مسلمانوں نے اس دفعہ انتہائی دانشمندی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے دستور کو ختم ہونے سے بچانے اور ملک کی پیشانی سے کالا دھبہ مٹانے میں بہت اہم اور بڑا کردار ادا کیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے یہ دائمی حل نہیں، انہیں ایک بار کانشی رام کے فارمولے پر عمل کرنا ہوگا۔ یہ کانشی رام کی سیاسی سمجھ کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہر سیاسی پارٹی دلتوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے؛ کیونکہ ان کی بڑی تعداد متحد ہے اور اپنے ہی لوگوں کو ووٹ کرتی ہے، ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کینڈیڈیٹ شاید نہ جیتے؛ لیکن پھر بھی ووٹ دلت کو ہی دیتے ہیں، تھوڑا ہی سہی؛ مگر ان کا ووٹ متحد تو ہے اور اسی سبب رولنگ پارٹی میں ان کی نمائندگی کا بھرپور خیال رکھا جاتا ہے۔

اگر مسلمان بھی ایسا ہی کریں تو بے شک اس میں وقت ضرور لگے گا؛ تاہم بات کسی نہ کسی حد تک ضرور بنے گی اور وہ پھر بارگیننگ کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ اس کے لیے مسلم قیادت والی پارٹیوں کو خود کو پوری قوت کے ساتھ میدان میں اتارنا ہوگا۔ عام مذہبی قیادت بہت زیادہ سیاسی سوجھ بوجھ نہیں رکھتی اور نہ ہی اس کی پیچیدگیوں سے بہت زیادہ واقف ہے، اس لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ مولانا بدرالدین اجمل، اسدالدین اویسی اور ڈاکٹر ایوب وغیرہ پہلے خود کو متحد کریں اور ذاتی نفع و نقصان سے اوپر اٹھ کر مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کی قسم اٹھائیں اور مذہبی قیادت کو چاہیے کہ فرمان جاری کرنے کے بجائے سیاست دانوں کے ساتھ میز پر بیٹھے اور متفقہ موقف طے کر کے اٹھے۔ دونوں باہم مل کر پہلے متفقہ پالیسی طے کریں اور پھر رائے عامہ ہموار کریں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مسلمانوں کی لیڈر شپ دھیرے

دھیرے ختم کی جارہی ہے لہذا اس طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے، مشکل وقت بتا کر نہیں آتا۔

سوال ۳: ۲۰۲۴ء کے انتخابات کے نتائج ۲۰۲۹ء کے انتخابات پر کس طرح اور کس حد تک اثرانداز ہوں گے۔ اور وہ کیا مدّے ہوں گے جن کو سامنے رکھ کر الیکشن لڑے جائیں گے اور عوام کن مدّوں پر ووٹ کرنا پسند کریں گے؟

جواب ۳: غریبی، مہنگائی، بے روزگاری اور کرپشن یہ دائمی ایشوز ہیں، نہرو سے لے کر اب تک زندہ ہیں؛ بلکہ سیاست کی خوراک ہیں، ان میں کمی کے دعووں کے باوجود اضافہ ہی دیکھنے کو ملا ہے۔ صحت، تعلیم، امن و تحفظ کسی سیاسی پارٹی کا سیریس ایشو نہیں ہوتا؛ کیونکہ عوام کو مائک توڑ تقریر سننے اور ماحول کو گرم کر دینے والے نیتا پسند ہیں، عوام اگر ہر بلاک اور تحصیل لیول پر صحت و تعلیم کا پُر زور مطالبہ شروع کر دیں اور دستوری حقوق کا استعمال کریں تو کیا مجال کہ حکومت نہ سنے؛ لیکن پھر وہی بات کہ اس کے لیے مخلص و نڈر قیادت چاہیے! جس کا مسلمانوں میں تو فقدان ہے۔ تعلیمی توجہات سے عوام میں پیدا ہوئی سیاسی بیداری یہ بتاتی ہے کہ اب بہت جلد ملک میں روزگار کے علاوہ تعلیم و صحت، امن و تحفظ اہم ایشوز ہو سکتے ہیں۔ اور ۲۰۲۹ء کے انتخابات میں یہ اپنا کام کریں گے، شاید بھرپور طریقے سے۔

سوال ۴: تعلیمی اور سیاسی میدان میں آپ کے جو تجربات رہے ہیں، ان کی روشنی میں آپ کے پاس امت کے مستقبل کے لیے کیا لائحۂ عمل ہے کہ وہ ملک کی زعفران زدہ سیاست میں اپنا رول کس طرح ادا کرے اور کس طرح سیاست پر اثرانداز ہو اور تعلیمی میدان میں اس کی کاوشیں کس نوعیت کی ہونی چاہئیں۔

جواب ۴: سیاست کو مزید آوارگی سے بچانے کے لیے اچھے علماء اور مخلص دانشوروں کی ضرورت ہے۔ تعلیمی میدان میں میرا بہت زیادہ عملی تجربہ نہیں ہے، البتہ ابتدائی تعلیم تو مادری زبانوں میں ہی ہونی چاہیے پھر اعلیٰ تعلیم کے تمام دروازے کھلے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کا مطلب صرف آئی اے ایس اور آئی پی ایس ہی نہیں؛ بلکہ سائنس کی دنیا میں، سماجیات اور معاشیات میں بھی آپ کا یعنی مخلص، محنتی اور ذی علم علماء کا انتظار ہے، میڈ کل، اس کے علاوہ عدلیہ اور تدریس میں آپ کی ضرورت ہے، بطور خاص خواتین کو میڈیکل، تدریس اور عدلیہ کی طرف آگے بڑھنا پڑے گا، صحافت بطور خاص انگریزی صحافت آپ کو پکار رہی ہے۔

ہر میدان میں توازن خاصا بگڑا ہوا ہے اس لیے مدارس کو تعلیمی قیادت کرنی پڑے گی اور یہی قیادت اچھے سیاست دانوں کو بھی جنم دے سکتی ہے۔ عصری دانش گاہوں نے جس طرح کی سیاست کو جنم دیا ہے اس میں بڑی گھٹن ہے اور نفسا نفسی کا عالم ہے، ان دانش گاہوں میں جو مشہور سیاسی افراد میدان کار میں آئے ہیں ان میں سے بیشتر ایسے رہے کہ ملکی و ملی مفادات پر ان کے اپنے ذاتی مفادات غالب رہے، الا ماشاءاللہ۔ اسی لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ذاتی ترقی پر سمجھوتہ آسانی سے کر لیا جاتا ہے؛ جبکہ قوم کے حق میں سمجھوتہ کیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے دردمند افراد کی ضرورت ہے نہ کہ بیان باز علماء اور منھ دراز دانشوران کی۔

میں بارہا کہتا ہوں کہ مدارس میں سیاسی، ثقافتی اور سماجی امور کے متعلق باقاعدہ تربیتی نظام ہوتا کہ وہ طلبہ جن میں

قائدانہ صلاحیتیں موجود ہیں ان کی قائدانہ صلاحیتوں کو نکھارا جاسکے، لیکن ہوتا اس کے بر خلاف ہے۔ ہمارے بچے جب مدارس سے باہر کی دنیا میں آتے ہیں تو باہر کی دنیا کا ماحول انہیں اجنبی محسوس ہوتا ہے اور انہیں لگتا ہے کہ وہ کٹے ہوئے پر لے کر بے کراں آسمان میں آگئے ہیں۔ میں کلا و حاشا مدارس پر تنقید نہیں کر رہا ہوں؛ بلکہ تجربے کی بنیاد پر عمومی منظر نامہ پیش کر رہا ہوں۔ لیکن مدارس کے یہی طلبہ جب یونیورسٹیوں سے نکل کر آتے ہیں تو ان کے اندر خود اعتمادی زیادہ نظر آتی ہے، ان میں قائدانہ صلاحتیں بھی نظر آتی ہیں بس کسی تجربے کار ہستی کا معمولی سہارا درکار ہوتا ہے۔ اس لیے مدارس کے طلبہ کو فراغت کے بعد یونیورسٹیز کا رخ ضرور کرنا چاہیے اور اس مقصد کے لیے برج کورس سے بھی بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

جہاں تک زعفران زدہ سیاست میں اپنا رول ادا کرنے اور سیاست پر اثر انداز ہونے کی بات ہے تو اس کے لیے انہی کی طرح داؤ پیچ کھیلنے ہوں گے؛ بلکہ انہیں کے تیر آزمانے ہوں گے، ویسی ہی قربانیاں دینی ہوں گی، مقصد کا تعین کرنا، قیادت کو بنانا اور اس کے احکام کو تسلیم کرنا ہوگا، ناپسندیدہ بات پر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے سے پرہیز کرنا ہوگا، مسلسل جدوجہد کرنی ہوگی، اس راہ میں بہت سے مسائل کھڑے ہوں گے ان پر قابو پانے کے لیے ہر ممکن طاقت کو بروئے کار لانا ہوگا، یہ کام ایک فرد کا نہیں جماعت کا ہے۔ اور خاص طور پر ابتدائی مرحلے میں خود کفیل ہونا پڑے گا، ورنہ ساری کوشش ایک چندہ خور این جی او میں سمٹ جائے گی۔

سوال۵: امت کا ایک وہ اجتماعی خواب جو زوالِ امت کے بعد پھر کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا، یعنی مذہبی اور سیاسی پلیٹ فارم پر اتحاد کا خواب، مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کے آپ کی نظر میں کیا کچھ امکانات ہیں؟ اگر ہاں، تو کس حد تک؟

جواب۵: جس دن علماء اپنی تقریریں اپنے لیے یعنی اپنی قوم کے لیے کرنا شروع کریں گے اور سیاست کو خدمت سمجھ لیں گے اسی دن ان کے اس دیرینہ خواب کا تانا بانا درست کام کرنے لگے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ عوام یا عصری تعلیم یافتہ لوگ علماء کو تسلیم نہیں کرتے، ہاں یہ ضرور ہے کہ مکمل تسلیم نہیں کرتے، امام بناتے ہیں لیڈر نہیں۔ اور اس کی وجہ معاشی تنگدستی ہے، علماء امامت کے ساتھ تجارت بھی کریں، اپنی انکم بڑھائیں پھر وہ امام بھی ہوں گے اور سیاسی قائد بھی۔ اور مذہبی و سیاسی اجتماعیت کا خواب بھی دیر ہی سے سہی شرمندۂ تعبیر ضرور ہوگا، ان شاءاللہ۔

سوال۶: ۲۰۲۴ء کے انتخابات کے موجودہ نتائج کے بعد مسلمانوں کے لیے اپنی نئی سیاسی پارٹی تشکیل دینے یا پھر کسی موجودہ مسلم سیاسی پارٹی کو بھرپور سپورٹ دینے کے لیے، آپ کی سیاسی بصیرت کے حساب سے کیا یہ صحیح اور مناسب وقت ہوگا؟

جواب۶: گرم لوہے پر چوٹ ماری جاتی ہے؛ تاکہ مطلوبہ ہیئت وجود پاسکے، مسلمان سیاسی طور خود کفیل بننا چاہتے ہیں؛ لیکن کالی بھیڑیں بھوکی بکریوں کے لاغر پن کا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ کسی مسلم قیادت والی سیاسی پارٹی کو پوری طرح سپورٹ کیا جائے، کچھ مسلم پارٹیاں صوبائی سطح کی بھی ہوں، لیکن قومی پارٹی کے طور پر کسی ایک کے

جھنڈے تلے مسلمانوں کی اکثریت جمع ہو جائے، اسی طرح ریجنل سیاست میں، پھر دیکھیے ملک کی سیاست کا رخ کیسے بدلتا ہے، ایک پلیٹ فارم پر آئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اگر یہ سیاسی پلیٹ فارم وجود میں آجاتا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کی سیاسی بے وزنی کسی حد تک کم ہو جائے گی، بڑی پارٹیاں آپ سے بات کرنے میں اور آپ کے حقوق کے تئیں سنجیدہ ہوں گی اور یہی مسلم قیادت کی فتح ہوگی۔

بعض کالی بھیڑیں معصوم مسلمانوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتی ہیں کہ اگر اسد الدین اویسی، مولانا بدرالدین اجمل اور ڈاکٹر ایوب کی پانچ دس سیٹیں آ بھی جائیں گی تو کیا اس سے وہ سرکار بنالیں گے؟ یہ وہ دھوکا اور فریب ہے جس میں معصوم مسلمان پھنس جاتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے نام نہاد سیکولر پنجوں میں جکڑا جاتا ہے، اب جبکہ مسلمان متحد ہو کر ایک اتحاد کے ساتھ کھڑے ہو گئے ہیں اور ان کو اتحاد کا مطلب اور اس کی طاقت سمجھ میں آئی ہے تو ان کو اس وقت مسلم لیگ، نتیش، نائیڈ و اور پاسوان کی اہمیت کا حوالہ دے کر بڑی آسانی سے مسلم قیادت کے لیے موٹی ویٹ کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے لیے مذہبی قیادت کو بہت سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرنا ہوگا، اسے سیاسی تجربہ رکھنے والوں کی پالیسیوں اور منصوبہ بندی کو سپورٹ کرنا ہوگا۔ اس کے لیے بھی زمینی سطح پر بیداری کی سخت ضرورت ہے۔

سوال۷: اور پھر اگر مسلمانوں کی الگ سیاسی جماعت (فرض کریں کہ) کامیاب بھی ہو جاتی ہے تو کیا وہ مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور دینی مسائل حل کرنے میں کامیاب بھی ہوگی، کم از کم توقع کے مطابق؟ یا پھر جیسا کہ سمجھا جاتا ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کی الگ سیاسی جماعت مزید مسائل کو ہی جنم دے گی، آپ کے خیال میں زیادہ بہتر کیا ہے؟

جواب۷: موجودہ بڑی قومی وصوبائی پارٹیاں مسلم قیادت کو پنپنے سے روکنے کے لیے ہر طرح کا حربہ استعمال کرتی ہیں، یہ پارٹیاں آپ کو ایم ایل اے اور ایم پی تو بنائیں گی؛ لیکن قیادت نہیں دیں گی؛ تاکہ خالص شرعی معاملے میں بھی مولانا اسرار الحق مرحوم کی طرح اجازت کے بغیر آپ کچھ نہ کر سکیں۔ مسائل ہیں اور رہیں گے، بلکہ بڑھ بھی سکتے ہیں؛ لیکن مسلم اتحاد اور مسلم قیادت دھیرے دھیرے تمام مسائل پر یا بیشتر مسائل پر قابو پالے گی اور یہ اسی صورت میں ہوگا کہ اتحاد کا تسلسل اور قیادت کی عظمت کو مسلمان تسلیم کرتے رہیں۔ علماء کو بھی اپنا کردار نہیں بھولنا چاہیے کہ خالص مذہب بیزار سیاسی طاقتیں بہک جاتی ہیں، علماء کے کام کی اہمیت اس جگہ زیادہ ہے کہ وہ مذہب بیزار مسلم سیاسی نمائندوں کو پنپنے اور آگے بڑھنے سے روکیں، جیسے بھی وہ روک سکتے ہیں۔

سوال۸: ماضی میں کئی بار امت کی الگ سیاسی جماعت کی تشکیل کی کوششیں کی گئیں؛ مگر وہ کامیاب نہیں ہوئیں، اس کی کیا وجوہات رہیں؟ اور کیا فی الوقت موجودہ سیاسی منجدھار میں الگ سیاسی جماعت اپنا وجود قائم کر پائے گی؟ اور پھر کیا اسے استوار بھی رکھ پائے گی؟

جواب۸: کانگریس سے منسلک افراد نے اسے مسلمانوں کا نجات دہندہ سمجھ لیا، فسادات جو کانگریس کے دور حکومت میں

ہوئے ان کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ہر فساد کے بعد مسلمان کانگریس سے دوری بنانے کا اعلان کرتے تھے، لیکن وہ لوگ جو کانگریس پر گویا ایمان لائے ہوئے ہیں، وہ مسلمانوں کو گھیر بٹور کر پھر سے کانگریس کے ہاتھوں فروخت کر دیتے تھے۔ اس کے بدلے میں مسلمانوں کو کیا ملا؛ بلکہ خود انہیں بھی کیا ملا؟ مسلمان اپنی قیادت چاہتا ہے تبھی تو وہ کبھی وی پی سنگھ کے ساتھ، کبھی ملائم کے ساتھ، کبھی لالو اور نتیش اور کبھی مایاوتی کے ساتھ چلا جاتا ہے، مسلمان سمجھتا ہے کہ یہ اس کی اپنی پارٹیاں ہیں اور ان کے ساتھ جانے سے ہمیں بہت کچھ حاصل ہوگا۔ لیکن "كسراب بقيعة يحسبه الظمأن ماءا حتى إذا جاءه لم يجده شيئا ووجد الله عنده فوفاه حسابه" کے مصداق ملا کیا، سراب اور بے یقینی۔

اپنی قیادت کو وجود بخشنے کے لیے مولانا علی میاںؒ نے ہی ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کو میدان میں اتارا تھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو الیکشن لڑوایا تھا۔ لیکن کانگریسی مولوی اس قیادت کے سخت ترین مخالف ٹھہرے۔ مودی پہ یہ الزام ہے کہ اس نے اپوزیشن کو توڑ دیا، مگر ماضی میں کانگریس نے بھی یہی کام کیا تھا۔ اور انجام آپ کے سامنے ہے۔ مسلمانوں کے برعکس دلتوں میں کالی بھیڑیں گھس نہ پائیں، یادو اپنا کام کر لے گئے؛ لیکن مسلمانوں کو ڈرا دیا گیا، جمعیت علماء ہند نے اپنی سیاسی پارٹی ٹھنڈے بستے میں ڈال دی اور کانگریس کے دست نگر خود بھی ہو گئے اور بھارتی مسلمانوں کو بھی کانگریس کی غلامی میں دے دیا۔ مولانا بدرالدین اجمل کی مسلسل شکست کی اگر وجوہات تلاش کی جائیں تو بہت سے ایسے حقائق بھی نکل کر سامنے آئیں گے کہ آپ کو یقین ہی نہیں ہوگا۔

سیاست آسمان سے تارے توڑ لانے کا نام نہیں ہے؛ بلکہ دستوری حقوق کے حصول کے لیے مسلسل کوششوں اور قومی وصوبائی سطح پر عوامی خدمت کا توازن برقرار رکھنے کا نام ہے، اگر مسلمان چاہیں تو ایک اچھی مسلم قیادت وجود میں آسکتی ہے بشرطیکہ حرص وہوس کو چھوڑ کر قومی وملی مفاد میں کام کریں۔

سوال ۹: مسلمانوں کی ترقی وخوشحالی کے لیے دین ودنیا کی یکجائی کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟ کیا یہ ضروری بھی ہے، اگر ہاں تو کیا یہ ممکن بھی ہے؟

جواب ۹: کہتے ہیں کہ دین ودنیا کی یکجائی کی کوششوں میں لوگ ہرجائی بن بیٹھے، اسے لوگ کوئی ناممکن سی چیز سمجھتے ہیں؛ جبکہ دنیا بغیر دین کے آوارگی ہے، دین بغیر دنیا کے ناقابل قبول تصور، یہ دونوں آل موسٹ یکجا ہیں، بس بات افراط وتفریط یا کسی طرف زیادہ جھکاؤ کی ہے۔

سوال ۱۰: ایک اہم اور بڑا سوال یہ ہے کہ اس وقت عالمی سطح پر جو سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات بن رہے ہیں مسلمان بحیثیت امت ان حالات کی منجدھار میں کہاں کھڑے ہیں، کیا وہ ان حالات سے نبرد آزما ہونے میں کامیاب ہو سکیں گے اور پھر کس حد تک؟

جواب ۱۰: عالمی سطح پر سیاسی سماجی واقتصادی حالات میں مسلمان بہت سی دقتوں کا سامنا کر رہے ہیں، در اصل دشمن، سازشی وعسکری اعتبار سے بہت مضبوط ہے اور مسلمان اسی کی پناہ تلاش کر رہے ہیں، جس دن اپنی پناہ گاہ میں آئیں گے اور

دشمن کو دشمن سمجھ کر آگے بڑھیں گے اس وقت حالات یکسر بدل جائیں گے۔ معاشی طور مسلمان بہت کمزور نہیں ہے؛ البتہ تعاون علی البر و التقوی کم ہو گیا ہے۔ کیا فلسطین فروخت نہیں ہو چکا تھا صرف رسمی قبضہ ہی تو باقی تھا؛ لیکن فلسطینیوں کی بے خوفی اور استقامت نے دنیا کی چولیں ہلا دیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ مولانا علی میاںؒ نے اپنی نجی مجلس میں فرمایا تھا کہ دنیا میں کہیں پر بھی اگر چند منٹ کے لیے سہی اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو دنیا کا نقشہ بدل جائے گا۔ ''قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید''۔

☆☆☆

(بقیہ ص:۴۶ کا)

حواشی

(۱) Genesis 12:7
(۲) عہد نامہ قدیم، گنتی، باب ۱۳، آیت ۲۸-۳۲۔
(۳) ایضاً، کتاب القضاۃ، باب دوم، آیت ۱۱-۱۳۔
(۴) اسرائیل کی دیدہ ودانستہ فریب کاریاں (Deliberate Deceptions)، ص:۳۴
(۵) Jeremiah 9:3
(۶) تاریخ ارض القرآن، ص:۱۱۱۔
(۷) حقائق وثوابت في القضية الفلسطينية، ص۱۸
(۸) الاربعون فی القضية الفلسطينية، ص:۷
(۹) حقائق وثوابت في القضية الفلسطينية، ص۱۸-۱۹
(۱۰) القدس قضية كل مسلم، ص:۵۵-۵۶
(۱۱) ایضاً، ص:۴۶
(۱۲) یہودیت ونصرانیت، ص۱۳۶
(۱۳) مسئلہ فلسطین، ص:۱۶
(۱۴) تلخیص از مسئلہ فلسطین-سامراج اور عالم اسلام، ص ۱۴-۲۱
(۱۵) ایضاً، ص ۱۰
(۱۶) اسرائیل کی دیدہ ودانستہ فریب کاریاں (Deliberate Deceptions)، ص:۳۴
(۱۷) مفوضية الامم المتحدة لحقوق الانسان، ص:۵
(۱۸) فتاوىٰ معاصرة، ج:۶، ص:۲۹۵
(۱۹) فلسطین-قرض اور فرض، ص:۱۳

مراجع ومصادر

(۱) القدس قضية كل مسلم، یوسف عبداللہ القرضاوی، موسوعة الاعمال الكاملة، دار الشامية، بيروت، الطبعة الاولیٰ، ۲۰۲۲
(۲) حقائق وثوابت في القضية الفلسطينية، د محسن صالح، مركز الزيتونية والدراسات والاستشارات، بيروت، لبنان، نومبر ۲۰۲۰
(۳) الاربعون فی القضية الفلسطينية، د۔ محسن صالح، مركز الزيتونية والدراسات والاستشارات، بيروت، لبنان، نومبر ۲۰۱۷
(۴) مفوضية الامم المتحدة لحقوق الانسان، الامم المتحدة، نیویورک وجنیف ۲۰۰۴م۔
(۵) کتاب مقدس، بائبل سوسائٹی، ہند ۲۰۶، مہاتما گاندھی روڈ ۲۰۰۱-۲۰۰۰۔
(۶) تاریخ ارض القرآن، علامہ سید سلیمان ندوی، دار المصنفین، اعظم گڑھ، طبع جدید، اپریل ۲۰۱۴۔
(۷) یہودیت ونصرانیت، سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، جنوری ۲۰۱۱ء
(۸) مسئلہ فلسطین-سامراج اور عالم اسلام، مولانا واضح رشید حسنی ندوی، دار الرشید لکھنؤ، طباعت ۲۲، اکتوبر ۲۰۲۳ء
(۹) فلسطین-قرض اور فرض، ڈاکٹر محمد طارق ایوبی، ہدایت پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹر، نئی دہلی، ۲۰۲۳ء
(۱۰) Brooklyn, Deliberate Deceptions, Paul Findley, Lawrence Hill Books, New York, 1993
(۱۱) Bible,(NIV).
(۱۲) مسئلہ فلسطین، ایڈورڈ سعید، مترجم شاہد حمید، البلاغ پبلیکیشنز، نئی دہلی، جون ۲۰۲۳ء
(۱۳) فتاوىٰ معاصرة، یوسف القرضاوی، الطبعة الاولیٰ، ۱۴۴۴ھ، دار الشامية، بيروت، لبنان جزء ۶

آخری صفحہ

حرام کمائی سے بچو!

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلَّمَ قالَ: يَأْتِي علَى النَّاسِ زَمانٌ لا يُبالِي المَرْءُ ما أخَذَ منه، أمِنَ الحَلالِ أمْ مِنَ الحَرامِ۔ (صحيح البخاري۔ ۲۰۵۹)

(اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ آدمی کو کوئی پرواہ نہیں ہوگی کہ وہ مال کہاں سے کمارہا ہے؛ آیا حلال راستے سے یا حرام طریقے سے۔)

اسلام میں حرام کمائی سے روکا گیا اور حلال کمائی کی تاکید کی گئی ہے؛ کیوں کہ حلال رزق کشادگی اور برکت لاتا ہے، حرام رزق سے بلائیں آتی ہیں، دل سخت ہو جاتا ہے، ایمان کا چراغ گل ہو جاتا ہے، دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ اخلاق میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے، چوری چکاری، ڈاکہ زنی، غصب، رشوت، دھوکہ دہی، ناپ تول میں کمی، یتیموں کا مال کھانا اور عام لوگوں کا مال ناحق ہڑپ جانا وغیرہ کی عادت ہو جاتی ہے۔ حرام، حرام نہیں لگتا اور حلال بھی حرام طریقہ اختیار کر کے کھانے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے۔ پیٹ کی فکر میں انسان ایسا پھنس جاتا ہے کہ حقوق تلفی، قتل و غارت گری جیسے کالے کارناموں کو ہنر سمجھنے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ شیطان کے دکھائے ہوئے سنہرے خوابوں کی وجہ سے ہوتا ہے، وہ شیطان کو اپنا مسیحا سمجھنے لگتا ہے۔ حالاں کہ شیطان انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ﴾ [البقرۃ: ۱۶۸]۔ (اے لوگو! اپنے رب کا عطا کیا ہوا رزق کھاؤ، جسے زمین سے تمھارے لیے پیدا کیا ہے؛ مگر حرام چیزوں اور طریقوں سے اجتناب کرنا، اُسے مت کھانا جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔ اور نہ غصب، چوری، سود اور رشوت سے مال حاصل کر کے کھانا کہ اللہ نے ان سب کو حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح خبیث و گندی چیزوں؛ خون، خنزیر اور ان تمام چیزوں کے قریب بھی مت پھٹکنا، جنھیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔ حلال و پاکیزہ اشیاء استعمال کرو، زندہ رہنے بھر غذا کا حصول تم پر واجب ہے۔ حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرنے میں شیطان کے راستے پر مت چلو۔ تم پر اللہ کی شریعت پر چلنا لازم ہے۔ شیطان تو دشمن ہے وہ برائی ہی کا حکم دیتا ہے، ہر خیر سے روکتا ہے، ہلاکت کی ہی طرف لے جاتا ہے، ہدایت سے باز رکھتا ہے۔ شیطان کی دشمنی اور اس کا مکر و فریب اور دھوکہ دہی بالکل واضح اور ظاہر ہے۔)

بجا طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زمانہ آگیا ہے کہ انسان کو بالکل شعور نہیں ہے کہ وہ مال کیسے اور کہاں سے کمارہا ہے۔ فراڈ، دھوکہ بازی عروج پر ہے۔ فرد واحد سے لے کر عوام اور عوام سے لے کر حکومت تک اس فراڈ میں مبتلا ہے۔ اب تو باضابطہ ایسی کمپنیاں بنائی جاچکی ہیں، جن کا صرف اور صرف فراڈ بازی، دھوکہ دہی اور حرام

راستے سے مال کمانا کام اور مقصد ہے اور ان میں مسلمانوں کی بھی خاصی تعداد ملوث ہے۔ مسلم لڑکے لڑکیاں آنلائن بزنس کے نام پر خوب فراڈ بازی کر رہے ہیں۔ جوا کھیلنے کے نئے ذرائع آ گئے ہیں، بعض لوگ تو بعض ذرائع کو حلال کہنے پر مصر ہیں۔ لیکن جب اس پر تفصیلی بحث کی جائے تو پتہ چلتا ہے وہ صریح حرام ہیں۔

آج کل حرام ٹریڈنگ کا رواج عام ہے۔ بعض کم فہم علماء تک اس طرح کی چیزوں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کرکٹ کا اس قوم پر ایسا جنون چڑھا ہے کہ اللہ کی پناہ! سال میں مارچ اپریل/اپریل اور مئی کے مہینے تو صرف سٹّہ بازی اور جوّا بازی میں گزرتے ہیں۔ انڈین پریمیر لیگ (آئی پی ایل) اور پاکستان میں پاکستان سُپر لیگ (پی ایس ایل) نامی کرکٹ ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے آن لائن نہ جانے کتنے سٹّے ایپ ہیں، جنھیں لوگ کھیلتے ہیں، بعض لاکھ پتی و کروڑ پتی بن جاتے اور بعض روڈ پر آجاتے ہیں۔ اللہ محفوظ فرمائے۔

ایک اور حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”قیامت کے دن بندوں کے قدم اپنی جگہ سے نہیں ہٹ پائیں گے یہاں تک کہ ان سے چار چیزوں کے بارے میں سوال کر لیا جائے، ان میں سے ایک سوال مال کے بارے میں بھی ہوگا کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں پر خرچ کیا۔ (جامع ترمذی، حدیث: ۲۴۱۷)

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مال کو کمانے اور خرچ کرنے میں کس قدر احتیاط کی ضرورت ہے کہ قیامت کے دن اس کے بارے میں الگ سے سوال کیا جائے گا۔ کیا کوئی دانا اس شدید وعید کے بعد بھی حرام مال کو حاصل کرنے کا سوچے گا بھی، ہرگز نہیں! ہاں وہ شخص ضرور اس قبیح عمل کی کوشش کرے گا، جس کے اندر سے خوف خدا نکل چکا ہو اور وہ اپنے رب کی ملاقات پر یقین نہ رکھتا ہو۔

اس حدیث کے تحت کچھ چیزیں جاننا ضروری ہیں:

۱- اللہ کا خوف اور حیا حرام کمائی کے نتیجے میں نکل جاتی ہے۔
۲- حرام کمائی سے لالچ پیدا ہو جاتی ہے، قناعت سے دور ہو جاتا ہے، اور لالچ موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہے۔
۳- کمانے کے حرام طریقوں کا استعمال اور انھیں فروغ دینا قیامت کی نشانی ہے۔
۴- حرام ذریعے سے کمایا گیا مال اللہ تعالیٰ کے عذاب آنے کا سبب ہے۔
۵- اگر انسان کوشش کرے تو حلال کمائی کے ذرائع کبھی ختم نہیں ہوتے۔
۶- عمل صالح کی توفیق چھن جاتی ہے اور دعا قبول نہیں ہوتی۔
۷- رزق اور عمر کی برکت اٹھ جاتی ہے۔
۸- حرام کمانے والے کا دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے خالی ہو جاتا ہے۔

(م-ط-ب)

☆☆☆

غزل

فانی بدایونی

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اسے ہونا کہتے ہیں
نیست نہ ہو تو ہست نہیں یہ ہستی کیا ہستی ہے

عجز گناہ کے دم تک ہیں عصمت کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے راز بلندی پستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

وحشت دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

فانیؔ جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

★★★

R.N.I. No. UPURD/2009/32310
Postal Regd. No. ALG/104/2023-25

ISSN 2456-7175
Vol. XVI, Issue I (July- 2024)

NIDA-E-AETIDAL MONTHLY

Madrasatul Uloom-Al-Islamia, Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh (U.P.)
Under the management of:
Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation, Aligarh

www.nadwifoundationaligarh.org
Printed & Published by Saeed Ahmad Ansari Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation
Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at *Ideal Graphics Enterprises*, Patwari Nagla, Aligarh
Editor : Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi